



# تعلیم دین و تصدیق جبرائیل امین

﴿ حدیث جبرائیل کی فاضلانہ تشریح ﴾

سید

شیخ الاسلام علامہ محمد امجد علی

حضور سرسبز علامہ سید محمد رفیع الدین شریفی جیلانی



گلوبل اسلامک میشنز

بھارت اور پاکستان

سلسلہ اشاعت ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# تعلیم دین و تصدیق جبرائیل امین

﴿ حدیث جبرائیل کی فاضلانہ تشریح ﴾

شیخ الاسلام و المسلمین

حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی، جیلانی مدظلہ العالی

جانشین حضور محدث اعظم ہند رحمہ اللہ



گلوبل اسلامک میشنز  
گلوبل اسلامک میشنز  
نیو یارک، نیو یارک

بہا جازت حضور شیخ الاسلام

## ’جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ‘

نام کتاب: ’تعلیم دین و تصدیق جبرائیل ابن‘  
شارح: شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ العالی  
پیش لفظ: محمد مسعود احمد سہروردی، اشرفی  
کمپیوٹر کتابت: منصور احمد اشرفی  
اشاعت اول: شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ بمطابق ستمبر ۲۰۰۴ء تعداد: ۲۰۰۰  
اشاعت دوم: سفر ۱۴۲۹ھ / فروری ۲۰۰۸ء تعداد: ۱۰۰۰  
ناشر: گلوبل اسلامک مشن، انک  
نیویارک، یو ایس اے



Published By:



Global Islamic Mission, INC.

P.O. Box 100

Wingdale, NY 12594

U.S.A.

www.globalislamicmission.com

# فہرست

۵	پیش لفظ	﴿ ۱ ﴾
۱۱	’حدیث جبرائیل‘	﴿ ۲ ﴾
۱۳	جواہر پارے	﴿ ۳ ﴾
۲۸	حضور کیلئے مٹی کے چپوترے کی تعمیر	﴿ ۴ ﴾
۳۰	حضرت جبرائیل کا لباس بشر میں تشریف لانا	﴿ ۵ ﴾
۳۳	حضور کا حضرت جبرائیل کو پہچان لینا	﴿ ۶ ﴾
۳۷	حضرت جبرائیل کا بارگاہ رسالت میں ادب سے بیٹھنا	﴿ ۷ ﴾
۴۴	حضرت جبرائیل کا اسلام کے بارے میں سوال کرنا	﴿ ۸ ﴾
۴۶	توحید کا بیان	﴿ ۹ ﴾
۵۳	شرک کا بیان	﴿ ۱۰ ﴾
۵۵	محمد عربی ﷺ کی نبوت و رسالت کی شہادت	﴿ ۱۱ ﴾
۵۷	رسالت رسول کتنے کمالات جلیلہ اور صفات حمیدہ کی حامل ہے۔۔۔	﴿ ۱۲ ﴾
۶۵	صلوٰۃ کا بیان	﴿ ۱۳ ﴾
۶۶	زکوٰۃ کا بیان	﴿ ۱۴ ﴾
۶۶	روزہ و رمضان کا بیان	﴿ ۱۵ ﴾
۶۷	حج کا بیان	﴿ ۱۶ ﴾



(18)

◀ 19 ▶

❧❧❧



﴿ ۲۲ ﴾

( ۲۴ )

﴿ ۴۴ ﴾

❖ ۱۵ ❖



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## پیش لفظ

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي وَنُسَلِّمُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

اما بعد

تمام تعریفیں اُسی رب کائنات کیلئے ہیں کہ جس نے سب سے پہلے نور مصطفیٰ ﷺ کی تخلیق فرمائی اور اپنے محبوب کے باعث ہم پر اپنی ربوبیت کو ظاہر فرمایا۔۔۔ کہ جس نے ہمیں عدم سے وجود بخشا۔۔۔ اپنی مخلوق میں شامل فرمایا۔۔۔ صرف یہی نہیں بلکہ اشرف المخلوقات بنایا۔۔۔ ایمان والا بنایا۔۔۔ بلکہ اس رب العالمین نے ہمیں امتِ رحمۃ العالمین بنایا۔۔۔ اس رب کی ہم پر کروڑوں نعمتیں ہیں۔ اپنے حبیب کی بعثت مومنین پر اسکی نعمت عظمیٰ ہے۔ شکر ادا کیا جائے تو کیسے اور کس طرح؟۔۔۔ کیا جو کچھ اس مالک نے ہمیں عطا فرمایا ہے اُسی کی راہ میں خرچ کر دینے سے کامل شکر ادا ہو جائے گا؟۔۔۔ میری ناقص رائے میں نہیں ہوگا۔۔۔ مگر ہم کبھی کیا سکتے ہیں۔۔۔ ہم مخلوق ہیں، وہ خالق ہے۔۔۔ ہم کمزور ہیں، وہ طاقت والا ہے۔۔۔ ہم معذور ہیں، وہ قدرت والا ہے۔۔۔ بس اگر وہ مالک دو جہاں، رب کریم ہمارے ناقص طریقوں سے ادا کئے گئے شکرانوں کو قبولیت کا درجہ عطا فرمادے اور خود ہی ہماری بات بتا دے، تو یہ اسکا فضل و کرم ہوگا۔۔۔ ہم سب اسی کے محتاج ہیں اور بس وہ ہی غنی ہے۔

البتہ اسکے حبیب سے کی گئی محبت، اسکے رسول کی گئی غلامی، آقائے دو جہاں کی بھرپور وفاداری، ناموس رسول ﷺ کیلئے دی گئی ہر قربانی اور دین مصطفوی ﷺ کیلئے خون تو خون، پسینہ بھی بہا، تو اُس رب کی بارگاہ میں انشاء اللہ مقبول ہے۔۔۔ ہمیشہ کی کامیابی صرف اور صرف رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے وابستہ ہے۔۔۔ دین ملے گا تو آپ ہی کے در سے۔۔۔ ہدایت ملے گی تو آپ ہی کے وسیلہ سے۔۔۔ عزت ملے گی تو وہ ہیں سے۔۔۔ آبرور ہے گی تو انہی کے کرم سے۔۔۔ کامرانی ملے گی تو آپ ہی کی لگی سے۔۔۔ پارسائی ملے گی تو آپ ہی کی خاک پا سے۔۔۔ چین، سکون، آرام جو چاہو ملے گا، تو ملے گا گنبد خضراء کے مکیں سے۔۔۔ آئیے اور

لوٹے۔۔۔ لوٹ لوٹ کر تھک جائیں گے مگر یہاں کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔۔۔ آئیے محبوب رب دو جہاں کی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے خود بھی دین متین کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کریں اور دوسروں کو بھی نیکی کرنے اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے اپنے کو درج ذیل آیت مبارکہ کا مصداق ٹھہرائیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔۔۔ الخ

﴿سورہ آل عمران: ۱۱۰﴾

تم ان ساری امتوں میں بہتر ہو جو لوگوں کیلئے ظاہر ہوئیں کہ بھلائی کا تو تم علم دو اور برائی سے روکو۔۔۔۔

رب تبارک و تعالیٰ کا پیغام غیر مسلموں تک پہنچانے کیلئے اور حب مصطفیٰ ﷺ کو مسلمانوں میں عام کرنے کیلئے اور جو فتنے دین میں کارگزاری کر رہے ہیں، انکے سیلاب کو روکنے کی کوشش کرنے کیلئے ہی، گلوبل اسلامک مشن کا قیام، نیویارک، امریکہ میں عمل میں لایا گیا تھا۔ مالک دو جہاں کے کرم سے، حبیب کبریاء ﷺ کے طفیل اور بزرگان دین کی توجہ اور کرم نوازی سے یہ ادارہ پر خلوص انداز میں اپنے مقاصد حاصل کرنے میں پوری طرح کوشاں ہے۔

اہلسنت کی مساجد کی خدمت، مذہبی پروگراموں کا انعقاد، مدرسوں کے قیام کی کوششوں کے علاوہ بزرگان دین و مسلک کی تعینات کا پھیلاؤ اور انکے انگلش میں تراجم، جن سے اسلام کی ترویج و اشاعت ہوتی ہو، شائع کرنا اس مشن کا مقصد عظیم ہے۔ یہ کتاب ہمارے اشاعتی سلسلے کی گیارھویں کڑی ہے۔ ہماری بقیہ مطبوعات کی تفصیل پیچھے کے کور پر ملاحظہ فرمائیے۔

زیر نظر کتاب تعلیم دین و تصدیق جبرائیل اثن، مشہور حدیث، حدیث جبرائیل کی مفصل شرح ہے، جسے رئیس المحققین، شیخ الاسلام والمسلمین، پیر طریقت، رہبر شریعت، حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ العالی نے قلمبند فرمایا ہے۔

☆ آپ خاندان اشرفیہ کے وہ چشم و چراغ ہیں کہ جس نے اس خاندان کی اشرفیت کو مزید اشرف بنا دیا ہے۔ بقیۃ السلف، خیر الاتقیاء، شیخ الحدیث ابو القحۃ حضرت علامہ مفتی نصر اللہ خان صاحب افغانی دست برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں اس خاندان کے ہندوستان پر بہت احسانات ہیں۔

☆ آپ سند المسکونین، رئیس الواعظین، مفسر قرآن، مبلغ اسلام، حضور محدث اعظم ہند حضرت علامہ سید محمد کچھوچھووی علیہ الرحمۃ کے جانشین ہیں، کہ جنہوں نے مسلک حقہ کی ترویج و

اشاعت کیلئے اپنی حیات کا ایک ایک لمحہ وقف کر رکھا تھا۔

☆ شیخ الاسلام کی محققانہ تصنیفات کو دیکھتے ہوئے، غزالی دوراں، امام اہلسنت، مفسر قرآن، حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمۃ نے آپ کو رئیس المحققین کے خطاب سے نوازا۔

☆ آپ محدث اعظم مشن کی روح رواں ہیں کہ جس مشن کی شاخیں ہندوستان سے برطانیہ تک پھیلی ہوئی ہیں اور دین اسلام کی پر خلوص خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اسکے علاوہ آپ کے فیض کرم سے فیضیاب ہو کر سینکڑوں علمائے اہلسنت، لاکھوں مریدین و معتقدین، جو آپ سے نسبت کو اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتے ہیں، دنیائے اسلام میں جگہ جگہ سواۓ اعظم اور حق کی پاسداری میں دن رات ایک کئے ہوئے ہیں۔

انہیں مریدین، معتقدین و محبین کی جماعت میں اس مشن کے سارے کارکنان بھی شامل ہیں۔ حضرت سے ہماری پہلی ملاقات، بلکہ یوں کہئے کہ حضرت کے جلوؤں پر ہماری پہلی نظر، شکاگو، امریکہ میں میلاد کے ایک عظیم الشان جلسے کے دوران پڑی، جبکہ آپ اسٹیج پر رونق افروز تھے اور ہم حیران سامعین کی آخری صف سے اچک اچک کر حضرت کی طرف متوجہ تھے اور سوچتے جاتے تھے کہ اس سے پہلے کی ہماری ۴۰ سالہ زندگی بے کار ہی گزر گئی کہ اس بزرگ ہستی سے واقفیت نہ تھی۔

اپنے منفرد انداز میں حضرت، خطاب کے شروع میں اپنے اشعار سے سامعین کو نوازتے ہیں۔ بس انہیں اشعار نے ہمیں حضرت کا گرویدہ بنا دیا۔ ہم ایک ہزار میل کا سفر طے کر کے بائی روڈ، نیویارک سے شکاگو، اس جلسے میں شرکت کیلئے گئے تھے، کہ جسکی اطلاع مسعود ملت، ماہر رضویات، حضرت علامہ ڈاکٹر پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب مدظلہ العالی نے ہمیں دی تھی۔ حضور شیخ الاسلام کی دست بوسی کا موقع اس جلسے میں تو ہمیں نصیب نہ ہوسکا اور ظاہری فاصلے بھی جوں کے توں رہ گئے اور ہم ناکامی، قسمت کو لیکر نیویارک واپس آ گئے۔ مگر پورے ایک سال بعد جب حضرت پھر امریکہ تشریف لائے تو ہمارے اجڑے ہوئے چمن میں بہار آ گئی اور نہ صرف یہ کہ دست بوسی کا موقع ملا، بلکہ تقریباً ۱۰ روزہ حضرت کے قیام کے دوران حنفی کنٹریکٹر صاحب کی مہربانیوں کی وجہ سے کافی وقت حضرت کے ساتھ گزارنے کا موقع نصیب ہوا۔

بس پھر کیا تھا حضرت کی نظر کی سیاہی اثر نے اپنا کام کیا اور ہماری قسمت کا ستارہ ترقیوں کی منزلوں کی طرف گامزن ہو گیا اور آج دین اسلام اور مسلک حقہ کی خدمت کے سوا کوئی اور سودا دل و دماغ میں نہیں سماتا۔ حضرت نے اپنی تصنیفات کی اشاعت کی اجازت ہمیں عطا فرمائی اور اپنے والد بزرگوار کا ترجمہ قرآن و تفسیر (پہلا پارہ) بجا جازت اشاعت بھی ہمیں مرحمت فرمایا۔ اپنی دعاؤں میں ہمیں شامل حال رکھا۔ اور یوں ہم ۷۷ برس کے قلیل عرصے میں حضرت کے فیض سے فیضیاب ہوتے رہے۔

اب ہمیں زیر نظر حدیث، یعنی حدیث جبرائیل کی مفصل شرح جسکے شارح شیخ الاسلام حضرت مدنی صاحب ہیں، کی اشاعت کا شرف بھی حاصل ہو رہا ہے۔ اس سے قبل کی اشاعتوں میں ہم اپنے قارئین کے گوش گزار کر چکے ہیں کہ ۱۹۷۱ء میں حضور شیخ الاسلام نے ’تفہیم الحدیث‘ کے عنوان سے حدیث کی مشہور و معروف کتاب ’مشکوٰۃ شریف‘ کی مفصل شرح لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جو قسط وار ماہنامہ المیزان میں ہر ماہ پابندی سے چھپنے لگا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک ’المیزان‘ نکلتا رہا۔ ’المیزان‘ کے بند ہو جانے کے بعد حدیثوں کی شرحیں لکھنے کا سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔۔۔۔۔ زیر نظر حدیث، ان میں سے ایک ہے۔ اس سے پہلے ہم ’حدیث نبی‘ اور ’حدیث محبت‘ کی شرحیں علیحدہ علیحدہ اپنے قارئین کی نظر کر چکے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد ہی باقی حدیثوں کی شرحیں یکجا کر کے مجموعے کی شکل میں اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔

’حدیث جبرائیل‘ ایک بہت ہی مشہور و معروف حدیث پاک ہے جو دین اسلام کے تمام بنیادی اصولوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس کا جاننا ہر مسلمان کیلئے نہایت ہی ضروری ہے تاکہ وہ اپنے دین پر کسی تذبذب یا دھوکے کے عمل کر کے دارین کی فلاح حاصل کر سکے۔

حضور شیخ الاسلام نے نہایت ہی مفصل شرح تحریر فرماتے ہوئے حدیث کے ایک ایک لفظ کی سیر کرائی ہے اور شرح کا شکار ہوئے بغیر حدیث کے سلسلے میں تحقیق کا حق کامل طور پر ادا کیا ہے۔ حدیث شریف اور اس کے الفاظ و پیغام کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت نے ۱۵۳ نکات بیان فرمائے ہیں جن میں سے شروع کے ۵۹ نکات ’احمد الممعات‘ سے ماخوذ ہیں۔ جنہیں جواہر پاروں کے عنوان سے رکھا گیا ہے۔ ہر ہر نکتے کو صاف صاف دلیلوں سے واضح فرمایا گیا ہے۔



چنانچہ حضرت نے تقریباً ۴۰ آیات مبارکہ، ۲۵ سے زائد دوسری چھوٹی بڑی احادیث شریفہ، اور محدثین کرام کے سینکڑوں اقوال رقم فرمائے ہیں۔ بعض نکات کو بیان فرماتے ہوئے حضرت نے ضمن میں کئی کئی مضامین بیان فرمادیئے ہیں جن سے حدیث کا مطلب و منشاء کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔۔۔۔۔

رب ذوالجلال کی وحدانیت کی گواہی کا ذکر ہو یا رسول اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کی شہادت کا معاملہ ہو، خدا کی ذات و صفات اور توحید کی تمام قسمیں ہوں یا انکی تمام تر گہرائیوں کا بیان ہو، رسول ﷺ کی صفات و کمالات کا تذکرہ ہو یا رسالت کے تمام گوشوں کی تفصیل اور انکی شہادت کے بارے میں بیان ہو، اللہ رب العزت کے احکامات کی پابندی کا معاملہ ہو یا رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کا ذکر ہو یا ان کو حکم بنانے کا معاملہ اور انکے فیصلے کو دل سے ماننے کی ضرورت کا بیان ہو، مالک کے ذاتی علم کی بات ہو یا رسول خدا کے علم غیب عطا کی کیلئے دلائل ہوں یا آپ کے علم کی وسعت کو بیان کرنا مقصود ہو۔۔۔۔۔

بارگاہ رسالت میں حضرت جبرائیل کے ادب سے بیٹھے کا بیان ہو یا صحابہ کرام اور مؤمنین کیلئے آداب مجلس رسول کا ذکر ہو۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے بشری صورت میں آنے کی وضاحت ہو یا ان کے دوسرے احوال کا ذکر یا نبی کریم کا ان کو پہچاننے کا تذکرہ ہو۔ شرک جلی کی تفصیل ہو یا شرک خفی کی۔ نبوت و رسالت کا بیان ہو یا ان کے درمیان فرق کی پہچان کرانی ہو۔ حقیقت اسلام، حقیقت ایمان اور حقیقت احسان کی وضاحت مقصود ہو یا اسلام کے پانچوں ارکان اور ان کے فوائد قلمبند کرنا ہوں۔ ایمان بالملائکہ ہو یا ایمان بالرسول۔ ایمان بالکتاب ہو یا ایمان بالآخرۃ ہو یا قضا و قدر کی پیچیدگیوں کا بیان ہو۔ نماز کو اسکے جملہ حقوق کے ساتھ ادا کرنے کی ضرورت کا بیان ہو یا صوم و رمضان کے تعلق سے تمام تفصیلات کی وضاحت ہو۔ زکوٰۃ کو سمجھانا مقصود ہو یا حج کے تمام معاملات کی عقدہ کشائی منظور ہو۔۔۔۔۔ الغرض۔۔۔۔۔ بیشمار معاملات کی تفصیل کو مکمل دلائل اور خوبصورت مثالوں سے واضح فرما کر حضرت نے اس شرح کو بے مثال بنا دیا ہے۔

بہر حال، یہ آپ ہی کا خاصہ ہے کہ ایک حدیث کی شرح کے ضمن میں بے شمار نکات اور

معاملات کو اس طرح پرو دینا کہ مطلب و مقصد سے بھی نہ ہٹے اور قارئین حدیث شریف کے الفاظوں کی گہرائیوں میں اترتے چلے جائیں۔ ہم حضرت سے اپنی اس درخواست کا اعادہ کرتے ہیں کہ آپ اپنی مصروفیات سے قیمتی وقت نکال کر حدیثوں کی شرحیں تحریر فرمانے کا دوبارہ آغاز فرمادیں تاکہ حدیث نیت اور حدیث محبت اور زیر نظر حدیث، حدیث جبرائیل کی طرح دوسری مشہور و معروف حدیثوں کی شرحیں بھی عوام و خواص کیلئے ایک علمی خزانے کی شکل اختیار کر لیں۔ اور کلام اللہ کے ساتھ ساتھ کلام رسول کی منشا کو سمجھنے میں بھی آسانی ہو سکے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ شارح مدعا اعلیٰ کی صحت و عمر میں برکت عطا فرمادے تاکہ آپ کا علمی و روحانی فیض تادیر جاری و ساری رہے ﴿آمین﴾

یہ پیش لفظ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے لئے تحریر کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب اس کا دوسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے اسکے علاوہ حضرت ہی کی ’الاربعین الاشرقی‘ (چالیس احادیث کی مفصل شرح) بھی اسی ادارے سے شائع ہو چکی ہیں۔ جسکے لئے ہم اللہ رب العزت کے بے انتہا شکر گزار ہیں۔

ہم جناب علامہ محمد فخر الدین علوی اشرفی صاحب کے بے حد ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس شرح کی لفظ بلفظ پروف ریڈنگ اور تصحیح فرمائی۔ منصور احمد اشرفی بھی لائق صد تحسین ہیں کہ اس کی کتابت اور کورڈیز اٹن میں اپنا قیمتی وقت سرف کیا۔ آخر میں ہم اپنے قارئین سے التماس کرتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے دعائے خیر فرمائیں کہ اللہ رب العزت دین کی اس خدمت قلیل کو شرف قبولیت بخشے ہوئے ہمارے لئے اسے آخرت کا توشہ بنادے۔ اور ہمیں دین اسلام اور مسلک حقہ کی پیش از پیش خدمت کرنے کے مواقع عطا فرمائے۔

امین، بجاہ النبی الکریم والہ واصحابہ اجمعین

احقر ابو منصور

جیزمین

محمد مسعود احمد سہروردی اشرفی

گلوبل اسلامک مشن، انک

نیویارک کی، یو ایس اے

۱۴۲۷ھ بمطابق دسمبر ۲۰۰۵ء



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## حدیث جبرائیل

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا يُرَى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ حَتَّى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى فَخْذَيْهِ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ قَالَ الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتُحِجَّ الْبَيْتَ إِنْ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا قَالَ صَلَّيْتَ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ قَالَ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِمَا لَقَدْ رَخِّبَهُ وَشَرِّهَ قَالَ صَلَّيْتَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ تَعْبَادَكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمُسْتَوْثُلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا قَالَ لَنْ تِلِدَ الْأُمَمُ رَبَّتْهَا وَأَنْ تَرَى الْحَفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رُعَاةَ الشَّيْءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُنْيَانِ قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ لِي يَا عُمَرُ أَتَدْرِي مَنْ السَّائِلُ قُلْتُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ رَوَاهُ مُسْلِمٌ وَرَوَاهُ أَبُو هُرَيْرَةَ مَعَ اخْتِلَافٍ وَفِيهِ وَإِذَا رَأَيْتَ الْحَفَاةَ الْعُرَاةَ الضُّمَّ إِلَيْكُمْ مُلُوكَ الْأَرْضِ فِي خُمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ ثُمَّ قَرَأَ اللَّهُ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنْزِلُ الْغَيْثَ الْآبَتُ۔

﴿ متن علیہ ﴾

حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایک دن ہم لوگ بارگاہ رسالت میں حاضر تھے، اسی اثنا میں ناگاہ ایک شخص نہایت ہیبت و جلالت کی شان لئے ہوئے ہم پر ظاہر ہوا۔ جیسا کہ آفتاب و ماہتاب طلوع ہوتا ہے، جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال بہت ہی کالے تھے اس پر ستر کا اثر (شکار) بال کی غبار

آلودگی رنگ و روپ کی شگنی و سستی اور تمسک و غیرہ) نمایاں نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اسی شہر کا آدمی ہے اور حال یہ تھا کہ ہم میں سے کوئی اسے پہچان نہیں رہا ہے۔ یعنی وہ اس شہر کا نہ تھا اور نہ ہم میں سے کوئی نہ کوئی اس کو پہچان لیتا۔ یہاں تک کہ وہ نزدیک آ کر آنحضرت ﷺ کے سامنے آپ کی طرف مائل و متوجہ ہو کر بیٹھ گیا۔ جیسا کہ معلم معلم کے سامنے بیٹھتا ہے اور اپنے دوزاں کو آنحضرت ﷺ کے دوزاں سے ٹیک دیا یعنی متصل کر دیا۔ اور اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اپنی دونوں رانوں پر رکھ دیا۔ اور کہا اے محمد ﷺ مجھے بتائیے کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حقیقت اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ خدا کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور گواہی دے کہ محمد ﷺ یقیناً اللہ کے رسول ہیں جنہیں تبلیغ احکام کیلئے مخلوق خدا کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ نماز اس کے جملہ حقوق کے ساتھ ادا کرے اور یہ کہ زکوٰۃ دے اور یہ کہ رمضان کا روزہ رکھے اور یہ کہ بیت اللہ کا حج کرے، اگر حج کرنے کی طاقت رکھے۔ (یہ سن کر) اس آنے والے نے کہا، آپ سچ فرماتے ہیں۔ (حضرت عمر فرماتے ہیں) ہمیں اس کی بات سے نہایت حیرت ہوئی کہ خود ہی سوال کرتا ہے اور خود ہی تصدیق کرتا ہے۔ اس آنے والے نے کہا جب آپ نے اسلام کی حقیقت واضح کر دی ہے تو اب ایمان کی حقیقت سے بھی باخبر کر دیجئے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حقیقت ایمان یہ ہے کہ تو اللہ اور اس کے فرشتے، اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کی تصدیق کرے اور تقدیر کے خیر و شر کی تصدیق کرے۔ آنے والے نے کہا، آپ نے سچ فرمایا، پس خبر دیجئے کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ حقیقت احسان یہ ہے کہ تو خدا کی اس طرح عبادت کرے کہ گویا خدا کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہیں ہو تو کم از کم یہ خیال کرے کہ خدا تجھ کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے کہا آپ نے سچ فرمایا۔ اب قیامت کے وقت کی بھی خبر دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ مسئول عنہا کو اس بارے میں سائل سے، یعنی تجھ سے زیادہ علم نہیں۔ اس نے کہا تو اس کی نشانیوں کی خبر دیجئے۔ آپ نے فرمایا: علامات قیامت میں سے ایک علامت یہ ہے کہ باندی اپنے مالک اور آقا کو جنے گی اور تو دیکھے گا کہ شگے پاؤں، شگے بدن محتاج لوگ اور بکریاں چرانے والے محلوں میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد وہ شخص رخصت ہو گیا۔ میں بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ (یعنی سرکار سے یہ نہیں پوچھا کہ کون ہیں) پھر خود آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے عمر! کیا تجھے خبر ہے کہ یہ سوال کرنے والا کون تھا۔ میں نے کہا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے والا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ جبرائیل تھے، جو ہمیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ ہے کہ جب تو شگے پاؤں والوں، شگے بدن والوں، اور گھوگوں اور بہروں کو حکومت کرنے والا دیکھے۔ قیامت کا علم ان پانچ باتوں میں سے ہے جب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ پھر آپ نے تلاوت فرمائی:

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ۔۔۔ الخ

## جواہر پارے

۱۔۔۔۔۔ حدیث مذکورہ کا نام ’حدیث جبرئیل‘ ہے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں سائل سیدنا جبرئیل علیہ السلام ہیں، لہذا اس کو حدیث جبرئیل کہہ دیا گیا۔ اس کا دوسرا نام ’ام الاحادیث‘ اور تیسرا نام ’ام الجوامع‘ ہے، اسلئے کہ احادیث سے جتنے علوم کی تعلیم ہوئی ہے۔ یہ حدیث ان تمام علوم پر مشتمل ہے۔ جس طرح فاتحہ الکتاب کو بھی ام القرآن اور ام الکتاب کہتے ہیں، اسلئے کہ یہ سورہ مبارکہ قرآن کریم کے جملہ معنی و مقاصد کو متضمن ہے۔

۲۔۔۔۔۔ جملہ ائمہ حدیث اس حدیث کی صحت پر متفق ہیں۔ بخاری و مسلم اور دوسرے ائمہ کرام نے اپنی کتابوں میں مختلف صحابہ کرام کے طریق سے اس حدیث کی روایت کی ہے۔

۳۔۔۔۔۔ حدیث اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ کے بعد، جو جملہ طاعات و عبادات کی اصل الاصول ہے، اس حدیث کو کتاب الایمان (مشکوٰۃ شریف) میں اسلئے ذکر کیا کہ یہ حدیث دین کے جملہ اصول و فروع پر مشتمل ہے۔

۴۔۔۔۔۔ فَاسْتَنْدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت سے اتصال و قرب میں مبالغہ فرمایا تا کہ دونوں جانب سے سوال و جواب کا سننا سنانا آسان ہو جائے۔ یا اس کی وجہ وہ کمال و داد و محبت اور غایت موانست تھی جو ان کے مابین تھی۔

۵۔۔۔۔۔ وَضَعَ كَفْفِيهِ عَلَى فَخْذَيْهِ اس کا ایک مطلب وہ ہے جو ترجمہ میں گزرا کہ حضرت جبرئیل نے اپنی ہتھیلیوں کو اپنی دونوں رانوں پر رکھا، جیسا کہ صورت ادب اور معلمین کا طریقہ ہے۔ یہ بظاہر حضرت جبرئیل کے آنے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہونے، اور آپ کے سامنے بصورت معلم بیٹھنے کے زیادہ مناسب ہے۔ لیکن روایت نسائی میں بصراحت یہ آیا ہے۔۔۔۔۔

حَتَّى وَضَعَ يَدَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔۔۔ لہذا اس کے پیش نظر زیادہ رائج یہ ہے۔۔۔ وَضَعَ كَفْفِيهِ عَلَى فَخْذَيْهِ۔۔۔ کا ترجمہ مطلب یہ بیان کیا جائے کہ رکھا آنے

والے نے اپنے دونوں کف دست، آنحضرت ﷺ کی دونوں رانوں پر، آپ کی تمکین و مشیت کیلئے تاکہ آپ کلام کو بغور سماعت فرمانے اور اس کے سمجھنے اور سمجھانے میں حاضر و ثابت رہیں۔ اور سائل کی طرف آپ کی توجہ کامل اور غایت انتہات رہے۔

حضرت جبرئیل، گویا ہر سائل و متعلم کی صورت میں تھے، لیکن درحقیقت وہ حاضرین کو دین کے احکام سنانے اور ان کی تعلیم کیلئے آئے تھے، جیسا کہ آخر حدیث سے معلوم ہو جائے گا۔ لہذا وہ معلم ہوئے اور حضور ﷺ پر حق تعالیٰ کی جانب سے ملتی علم ٹھہرے۔ حضرت جبرئیل کی طرف تعلیم کی اسناد قرآن مجید میں واقع ہے۔ فرمایا گیا ہے:

عَلَّمَہُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ذُو مِرَّةٍ ﴿سورة النجم: ۶، ۵﴾

سکھایا اسکو سخت قوتوں والے، طاقتور نے ﴿معارف القرآن﴾

﴿والله اعلم﴾

۶۔۔۔۔۔ آنحیرئیی عنی السلام: یہ طیب خاطر و بردبار و غیث کسی کی فرماں برداری کرنا اور اسکے آگے گردن جھکانا اور اسکے سامنے فروتنی و عاجزی کا اظہار کرنا اور بغیر کسی اعراض و سرکشی کے، اسکے حکم کے آگے سر تسلیم جھکا دینا۔ یہ ہے لغت میں اسلام کے معنی۔ اور شرع میں اسلام، احکام الہی کی اطاعت اور اسکے آگے سر نیا زخم اور دین اسلام کے ارکان خمسہ کے بجالانے کو کہیں گے۔

۷۔۔۔۔۔ اسلام نام ہے ظاہر اعمال کا، ایمان باطن اعتقاد کا، اور دین اسلام و ایمان کے مجموعہ کا۔

۸۔۔۔۔۔ باب عقائد میں اسلام و ایمان کو ایک کہا گیا ہے۔۔۔۔۔ بایں معنی۔۔۔۔۔ کہ ہر مومن مسلم ہے اور ہر مسلم مومن۔ کسی مسلمان سے ان دونوں میں سے کسی ایک کی بھی نفی نہیں کی جاسکتی اور درحقیقت اسلام، ایمان کا ثمرہ اور اس کی فرع ہے۔

۹۔۔۔۔۔ اَلَا سَلَامٌ اَنْ تَشْهَدَ۔۔۔ الخ حق تعالیٰ کی وحدانیت اور سرکار عربی کی رسالت کی گواہی دینا اسلام کے جملہ ارکان سے پہلا رکن ہے۔ ظاہر حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ ’شہادت‘ کا تکلم شرط اسلام ہے۔ تو اگر کوئی ’اشہد‘ کی جگہ ’علم‘ کہے، تو مسلمان نہ ہوگا۔ لیکن یہ امر ثابت شدہ ہے کہ بہ سبب ضرورت و بیانی اگر صرف لَ اِلَہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ ہی تصدیق قلبی کے

۱۰۔۔۔ تَقِيْمُ الصَّلٰوةِ: صحت اور درستگی کے ساتھ نماز ادا کرنا، جس میں ارکانِ نماز کی

ادائیگی میں طمانیت و تعدیل بھی ہو اور شرائط کی محافظت بھی۔ سنوں کی رعایت بھی ہو اور اسکے ادب کا لحاظ بھی۔ یہ ہے 'اقامت صلوة'۔ ممکن ہے اقامت صلوة سے مراد نماز کی کا حقہ مداومت اور اسکی ملازمت ہو۔

۱۔۔۔ تَوَتَّى الزَّكَاةُ: لغت میں زکوٰۃ، نمود و زیادتى اور تطہیر کو کہتے ہیں۔ زکوٰۃ دینا مال کی زیادتی کا سبب اور اس میں برکت کا موجب ہے۔۔۔ نیز۔۔۔ زکوٰۃ دینے سے ایک طرف مال کی طہارت ہوتی ہے، تو دوسری طرف دینے والا بخل و افساک کے اوصاف و رذیلہ سے ظاہر اور پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ اسکے تذکرہ شوہد سے بھی مشتق ہونے کا احتمال ہے۔ گویا زکوٰۃ شامد و گواہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والا اپنے ایمان میں صحیح اور محبت پروردگار کے دعویٰ میں سچا ہے۔

۱۲۔۔۔ تَصُومُ رَمَضَانَ: صوم لغت میں اسماک، یعنی لگا رکھنے، بچانے اور روکنے کو کہتے ہیں اور عند الشرع اپنے نفس کو کھانے، پینے اور مباشرت سے روک رکھنے اور بچانے کا نام روزہ ہے۔۔۔ بعض علما نے کرام، جن میں حضرت سفیان ثوری بھی ہیں کے نزدیک امور بندہ کو روزہ کے ساتھ ساتھ زبان کو غیبت سے بچانا بھی ضروری ہے۔ ان کے نزدیک غیبت کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، جس طرح کھانے پینے وغیرہ سے۔

۱۳۔۔۔ کامل روزہ یہ ہے کہ روزہ دار اپنے جمیع اعضاء و حواس کو شریعت کے جملہ 'نافرمودات' سے باز رکھے۔

۱۴۔۔۔۔۔ اگر رمضان ’اوضاع شرع‘ میں سے ہے، تو اس کی وجہ تسمیہ یہ ہو سکتی ہے کہ رمضان ’رمض‘ سے مشتق ہے اور ’رمض‘ کے معنی ’گرمی کی جلن‘ کے ہیں۔ چونکہ روزہ سے نفس جلنا اور پگھلنا ہے، لہذا اس علاقہ کی بنا پر ماہ روزہ کو رمضان کہہ دیا گیا۔ اور اگر وضع شرعی نہیں تو بقول بعض حضرات کے، ’تعیین‘ اسمائے شہور کے وقت ہوا گرم تھی اور موسم گرما تھا تو اس وقت جو مہینہ گرم نظر آتا اس کو رمضان قرار دے دیا گیا۔



۱۵۔۔۔۔۔ تَجِجُ النَّبِیَّ: خانہ کعبہ کا قصد کرنا اور وہاں پہنچ کر مناسک حج ادا کرنا، اصطلاح شرع میں، حج کہلاتا ہے۔

۱۶۔۔۔۔۔ اِنْ اَمْسَطَعْتَ اِلَیْهِ مَسِيْلًا: اکثر علماء کے نزدیک سلامتی کی راہ کے ساتھ ساتھ زادور احلہ کی فراہمی کو استطاعت کہیں گے۔ سلامتی راہ کے سلسلے میں ’غالب احوال‘ کا اعتبار کیا جائے گا۔ لہذا درمیان راہ میں دریا کا وجود راہ کی سلامتی کے منافی نہیں۔ اسلئے کہ اگر موسم خوشگوار ہو تو دریا میں سلامتی کے توقعات غالب ہیں۔ صحابہ کرام نے بھی جہاد کیلئے کشتی کا سفر اختیار فرمایا ہے، توجہ کیلئے بھی اسکے جواز میں کوئی شک نہیں۔ لہذا ’وجود دریا‘ فرضیت کو ساقط نہ کریگا۔

حدیث شریف میں ہے کہ وہ شخص شہیدوں میں سب سے زیادہ فضیلت والا ہے جو کشتی میں ڈوب کر شہید ہو، نیز آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسوں کی ارواح بے واسطہ ملک، قبض فرماتا ہے۔

۱۷۔۔۔۔۔ حضرت امام مالک کے نزدیک اس شخص پر حج فرض ہے جو پیدل چل سکے کی قوت و توانائی رکھتا ہو۔

۱۸۔۔۔۔۔ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَلِّيهُ: پوچھنا اور سوال کرنا، بظاہر جہل و نادانی پر دال ہے اور قصد بق کرنا علم و باخبری کی طرف مشعر و شیر۔ لیکن درحقیقت تعجب کا مقام نہیں ہے اس لئے کہ وہ سوال کرنے والے حضرت جبریل تھے، جو صحابہ کرام کی تعلیم و تذکیر کیلئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تھے، تا کہ وہ رسول کریم ﷺ سے سوال کریں اور آپ جواب دیں اور صحابہ کرام سنیں اور پھر نئے طور سے اس کو ذہن میں محفوظ رکھیں۔ یہ ساری باتیں آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ کے آخری عہد کی ہیں۔

۱۹۔۔۔۔۔ فَاتَّخِذْنِي عَنِ الْاِيْمَانِ: ایمان ان جملہ امور کی قصد بق کرنا اور ان کا گرویدہ ہونا ہے جو منجانب اللہ، رسول کریم ﷺ لائے اور بندوں تک پہنچایا۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ جن کے بارے میں یہ یقین سے معلوم ہو کہ رسول کریم ہی اس کو لائے ہیں۔۔۔۔۔ الحاصل۔۔۔۔۔ ان امور کا انتساب رسول کی طرف یقینی ہو۔ خواہ یہ قصد بق و گرویدگی بطور اجمال ہو۔۔۔۔۔ بایں طور۔۔۔۔۔ کہ یہ کہہ کہ حضور سرور عالم ﷺ جو کچھ بھی خدا کی طرف سے لائے سب حق ہے یا بطور تفصیل، اس طرح کہ رسول کریم ﷺ لائی ہوئی ہر چیز اور بتائے ہوئے ہر حکم کی الگ الگ قصد بق کرے۔

۲۰۔۔۔۔۔ ایمان سے متصف ہونے کیلئے 'ایمانِ اجمالی' کافی ہے۔ لیکن ایمانِ تفصیل کا درجہ اتم و اکمل ہے۔

۲۱۔۔۔۔۔ محض پیغمبر ﷺ کی سچائی کا جاننا اور حق کو پہچانا حصولِ ایمان میں کافی نہیں، جب تک کہ مرتبہ تصدیق تک نہ پہنچے، اور پھر باطن اس پر قرار نہ پکڑ لے۔ تصدیق سے مراد یہاں 'اذعان' ہے، جس کی تعبیر زبانِ فارسی میں 'گرویدن' سے کی جاتی ہے۔ لہذا مومنین کی صف میں ان اہلِ عناد و تکبر کا شمار نہ ہوگا جنہوں نے جان بوجھ کر حق کی معرفت اور صدقِ پیغمبر کا علم رکھنے کے باوجود، راہِ حق کو انکار کیا اور اسلام پر کفر کو ترجیح دیا۔ قرآن کریم میں ان کے انکاری کا نہیں بلکہ معرفت کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

يَعْرِفُونَ كَمَا يَخْفَى فَوْنِ آبْنَاءِ لَهُمْ ط ﴿سورة البقرة: ۱۳۶﴾

پہچانتے ہیں پیغمبرِ اسلام کو جیسے لوگ اپنے بیٹوں کو پہچانیں ﴿معارف القرآن﴾  
۔۔۔۔۔ نیز ارشاد فرمایا گیا:

وَجَحَلُوا بِهَا وَاسْتَكْبَرَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ----- ﴿سورة النمل: ۱۴﴾

اور ان کا انکار کر دیا اور یقین رکھتے تھے ان کے دل ﴿معارف القرآن﴾

۲۲۔۔۔۔۔ حقیقتِ ایمان صرف تصدیقِ قلبی ہے اور 'اقرارِ زبانی' فقط اجراءِ احکام کیلئے شرط ہے بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو۔۔۔۔۔ مثلاً۔۔۔۔۔ گوٹکا ہونا یا حالتِ اکراہ کا ہونا۔

۲۳۔۔۔۔۔ اس مقام پر بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کو شارع نے کفر کی علامت قرار دیا ہے۔۔۔۔۔ مثلاً۔۔۔۔۔ بت کا سجدہ، زنا، بارباندہنا وغیرہما۔ تو اگر بالفرض ان امور میں سے کوئی کسی امر کا مرتکب ہو جائے تو خواہ وہ اسلام کی تصدیق و اقرار دونوں رکھتا ہو، لیکن بحکمِ شارع وہ کافر ہے۔ اور اس کی تصدیق و اقرار کو فرضی قرار دیا جائے گا۔

۲۴۔۔۔۔۔ 'عملِ صالح' حقیقتِ ایمان میں داخل نہیں ہے بلکہ ایمان کے کمال کیلئے شرط ہے۔ لہذا 'ایمان' بے عمل ناقص ہوگا۔ لیکن۔۔۔۔۔ ہاں ہر۔۔۔۔۔ لفظِ ایمان کا اطلاق اس پر کیا جائے گا اور ایسے ایمان والوں کو مومن فاسق کہیں گے بشرطیکہ کسی گناہ کو خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ، حلال نہ کہتا اور نہ سمجھتا ہو۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ نہ ان کا استخفاف کرتا ہو۔ ابستت و جماعت کا بھی مذہب ہے



اور صحابہ و اسلاف کرام اسی اعتقاد کے حامل تھے اور فاسق کو مومن کہتے تھے اور ان پر احکام اسلام کا اجرا فرماتے تھے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرتے تھے۔

۲۵۔۔۔۔۔ بعض سلف صحابہ و تابعین سے یہ الفاظ منقول ہیں۔۔۔۔۔ الْإِيمَانُ تَصْدِيقُ بِالْقَلْبِ وَاقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْأَرْكَانِ۔۔۔۔۔ یہاں ایمان سے ’ایمان کامل‘ مراد ہے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ دلائل مذکورہ اور محققین کی تصریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ سب جو محدثین کرام سے منقول ہے اسی پر محمول ہے۔

۲۶۔۔۔۔۔ بعض حضرات کی ظاہری عبارتیں تحقیق مذکور کے مخالف نظر آتی ہیں۔۔۔۔۔ نیز بعض علماء متکلمین نے بھی قول مذکورہ کو اس کے ظاہری پر محمول کیا ہے اور قول کی نسبت سلف و محدثین سے کی ہے۔۔۔۔۔ مثلاً۔۔۔۔۔ صاحب مواقف، وغیرہ۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ تحقیق وہی ہے جو پہلے پیش کر دی گئی ہے۔

۲۷۔۔۔۔۔ خوارج، مرتکب کبیرہ، بلکہ صغیرہ کو بھی کافر کہتے ہیں۔ معتزلہ، نہ کافر کہتے ہیں نہ مومن، بلکہ ایمان و کفر کے مابین ایک واسطہ ثابت کرتے ہیں۔ یہ پہلی بدعت ہے جو باب عقائد میں پیدا کی گئی ہے۔ یہ حضرات قرآن کریم کی بعض آیات و احادیث کے ظاہری الفاظ سے تمسک کرتے ہیں اور ان آیات و احادیث کی جو مذہب اہلسنت و جماعت پر نص ہیں، تاویل کرتے ہیں۔ درحقیقت آیات و احادیث سے مراد وہی ہے جو اسلاف متقدمین نے سمجھا ہے، جو زبان دان دین اور مرد اشائے شریعت تھے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ آیات و احادیث کے قرآن و موار دکا پورا پورا علم رکھتے تھے، گو بظاہر اسکے خلاف نظر نہ آئے۔ نصوص کے سمجھنے اور اسکی مراد کی تعیین میں یہ ایک اصل عظیم ہے جس کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بدعتوں کی لغزشوں اور ان کی کجی کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اسلئے کہ وہ اس اصل عظیم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ومن الله العصمة والتوفيق

۲۸۔۔۔۔۔ اَنْ تُوْمِنُ بِاللّٰهِ: اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، خواہ ثبوتیہ ہوں یا سلبیہ، پر اعتقاد۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ اس کی جملہ نقائص اور علامات حدوث سے تقدیس و تنزیہ کی تصدیق کی جائے۔

۲۹۔۔۔۔۔ وَمَلْعَكِيْهِ: فرشتے اجسام نورانیہ ہیں، اشکال مختلفہ پر متشکل ہونے پر قادر

ہیں۔ اللہ کے بندے ہیں۔ نہ مرد ہیں نہ عورت۔ ان امور مذکورہ پر اور ان امور پر جو کتاب وسنت فرشتوں کے متعلق واقع ہیں، ایمان لانا، فرشتوں پر ایمان لانا کہا جائے گا۔

۳۰۔۔۔۔۔ وَكُتِبَ: اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اسکی تصدیق دی جائے کہ یہ ساری کتابیں اللہ تعالیٰ کا کلام قدیم ہیں، جو حرف وصوت سے خالی ہیں۔ جن کا اصل پیغمبروں پر حروف واصوات ایجاد کر کے کیا گیا ہے۔ اب یہ ایجاد خواہ لوح محفوظ پر ہو یا ملائکہ کی زبانوں پر، یا بے واسطہ ملک، حجاب کے پیچھے سے مسموع ہو۔ خدائے تعالیٰ کے جملہ کلام حق ہیں اور ثابت ہیں، جن میں قرآن مجید فصاحت و جامعیت کے لحاظ سے سب سے افضل ہے۔

بعض لوگوں کی تحقیق پر جملہ کتب آسمانیہ ایک سو چار ہیں۔ پچاس، حضرت شیث علیہ السلام پنازل ہوئیں، اورتیس، حضرت ادریس علیہ السلام پر، دس، حضرت آدم علیہ السلام پر، اور دس، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر۔ باقی چار کتابیں، توریت وزبور وانجیل وفرقان مشہور ہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

۳۱۔۔۔۔۔ وَزُيِّنَ: رسولوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اعتقاد کیا جائے کہ یہ اللہ کے پیغمبر ہیں، جنہیں مخلوق کی ہدایت اور ان کے معاش و معاد کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہے اور ان کی تائید معجزات و آیات بینات سے کی گئی ہے۔

۳۲۔۔۔۔۔ اصل نبوت میں فرق کئے بغیر جملہ انبیائے کرام پر ایمان لانا واجب ہے۔ ان کا احترام اور علامات نقص سے ان کی تنزیہ ضروری ہے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ برہانے قولی مختار، جملہ چھوٹے بڑے گناہوں سے ان کی عصمت کا عقیدہ لازمی ہے خواہ ظہور نبوت سے پہلے ہو یا ظہور نبوت کے بعد۔ اور جو کچھ بعض انبیائے کرام۔۔۔۔۔ مثلاً۔۔۔۔۔ حضرت یوسف و حضرت داؤد علیہما السلام کے متعلق بعض مفسرین وارباب قصص و اخبار نے نقل کیا ہے، صحیح نہیں ہے اور اگر ہے تو خطا و نسیان سے ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے جملہ برادران پیغمبر نہ تھے۔

قرآن مجید میں جو عصیاں کی نسبت حضرت آدم کی طرف کی گئی ہے اور عتاب دکھایا گیا ہے، یہ آپ کی شان قرب کی بلندی پر مبنی ہے۔ مالک کو اختیار ہے کہ وہ ترک اوئی یا ترک افضل پر بھی، گو وہ حد معصیت تک نہ پہنچے، اپنے بندے کو جو چاہے کہے، اور عتاب ظاہر کرے، لیکن دوسروں کی مجال نہیں کہ کہہ سکے۔ اس مقام پر ایک طریقہ ادب ہے، جس کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے، وہ

یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بعض انبیاء پر جو کہ مقرب بارگاہ ہیں عتاب و خطاب آئے۔۔۔ یا۔۔۔ ان حضرات کی جانب سے جو اس کے بندگان خاص ہیں، تواضع و انکسار کا مظاہرہ ہو، جو بظاہر مومن نقص ہو، تو ہمیں نہیں چاہئے کہ ہم بھی اس میں دخل اندازی کریں اور اس کو ہم بھی کہیں۔

۳۳۔۔۔ سید الانبیاء ﷺ کے حق میں اجمالی اعتقاد یہ ہے کہ مرتبہ الوہیت اور صفات الوہیت کے سوا جو کچھ ہے سب آپ کی ذات کیلئے ثابت ہے اور آپ جملہ بشری فضائل و کمالات کے جامع اور سب میں راسخ و کامل ہیں۔

۳۴۔۔۔ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ: یعنی اس محدود زمانے کا آخر، جس کی ابتدا موت کے بعد سے ہوتی ہے اور انجنا قیام قیامت۔۔۔ یا۔۔۔ دخول جنت پر ہوگی۔ اس پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعتقاد کیا جائے کہ جو کچھ شارح الطائیفہ نے اس کے متعلق خبر دی ہے وہ قطعی طور پر صحیح ہے۔ مندرجہ ذیل چیزوں کا شمار احوال آخرت میں ہے۔

(الف) عذاب قبر	(ب) قبر کی نعمتیں	(ج) علامات قیامت
(د) صور کا پھونکنا	(ه) بعثت	(و) جزا
(ح) میزان	(ط) صراط	(ی) جنت
		(ک) نار وغیرہ۔

۳۵۔۔۔ تو من بالقدر خیرہ وشرہ: ایمان بالقدر یہ ہے کہ اس بات کی تصدیق کی جائے کہ حق تعالیٰ نے تمام نیکیوں اور برائیوں کو روز ازل ہی جان لیا ہے اور مقدر و معین فرمادیا ہے اور جو کچھ کائنات میں ہوا اور ہوتا ہے، تمام اسی کے ارادے اور اسکی قضا و قدر سے ہے۔ جیسا کہ خود ارشاد فرمایا۔۔۔ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴿سورۃ القمر: ۴۹﴾ یعنی۔۔۔ بیشک ہم نے ہر چیز کو پیدا فرمایا اندازے سے۔۔۔ ہاں ہمہ۔۔۔ بندوں کو امر و نہی فرمایا ہے اور فعل و کسب میں انکو دخل دیا ہے اور ثواب و عذاب اس پر مرتب فرمایا ہے۔ درحقیقت ثواب اس کا فضل ہے اور عذاب اس کا عدل۔ اسباب کی تخلیق اور مسیبت کی ترتیب تمام اسی کی تقدیر ہے۔ یہ مسئلہ اور باب ایمان میں مذکور شدہ جملہ مسائل، علم کلام میں مبین و میرہن ہو چکے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ، باب الایمان بالقدر میں اس مقام کی مزید تحقیق و تفصیل پیش کی جائے گی۔ طالب صادق کو چاہئے کہ اصل مسائل کو اہل بحث و جدال کے قیل و قال کے بغیر حاصل کر لے اور اپنے گوشک و شبہ میں نہ ڈالے۔

۳۶۔۔۔۔۔ بعض روایتوں میں ایمان کے سوال و جواب کے ذکر سے پہلے اسلام سے متعلق سوال و جواب مذکور ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ایمان، اصل اسلام ہے اور اس پر مقدم ہے۔ یہاں کہ تحقیق ہو چکی ہے۔ لیکن اس روایت میں اسلام کو ایمان پر مقدم کیا۔ الاولیٰ فلاولیٰ کے اصول پر ارتقائی منازل کی نشاندہی کرانے کیلئے بیشک ایمان اسلام سے اونچا مرتبہ رکھتا ہے۔ تحقیق ایمان کے بعد احسان کے بیان کا آغاز کیا جو اسلام اور ایمان کا ’مرتبہ‘ متخیل و تجرید ہے جس کا اعلیٰ مراتب، اور اعلیٰ مقامات سے ہونا ظاہر ہے۔

۳۷۔۔۔۔۔ فَأَخْبِرُنِي عَنِ الْإِحْسَانِ: چونکہ بہت سی آیات و احادیث میں احسان کا ذکر آیا ہے جن سے اسکے درجہء عالی اور مرتبہء کمال پر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ لہذا اسلام و ایمان کے معنی کو دریافت کر لینے کے بعد حقیقت احسان کا بھی سوال کیا تا کہ امر دین تمام و کمال ظاہر واضح ہو جائے۔

۳۸۔۔۔۔۔ احسان کے معنی نیکی اور حسن سلوک کرنا۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ انعام و اکرام کے ذریعے لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔  
 ۲۔ خود اپنے نفس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرنا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ نیک افعال اور اچھے اعمال کو اپنی عملی زندگی میں کما حقہ پوری صحت اور کامل حسن و خوبی کے ساتھ داخل کر لیا جائے، گویا یہ بھی اپنے نفس پر ایک احسان ہے۔ اگر کوئی اس کے خلاف روش بنائے ہوئے ہے تو وہ اپنے نفس کے ساتھ برائی اور اس پر ظلم کر رہا ہے۔

احسان کی اس دوسری صورت کا حاصل یہ ہے کہ اپنی جملہ عبادات میں اخلاص، حضور اور خشوع کو لازمی سمجھا جائے اور درحقیقت یہ شرط کمال، بلکہ ایمان و اسلام کی صحت کی علامت ہے۔

۳۹۔۔۔۔۔ اَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَمَا تَنْتَ تَرَاهُ: بیشک جس کا یہ حال ہو گا وہ ایسے مقام پر ہو گا جہاں نہایت ہیبت، تعظیم، اجلال، خشوع و خضوع، حیا، زوق، شوق، محبت، انجذاب اور والہانہ وارفتگی کے جوہر تابناک ہوں گے۔ یہ مقام مشاہدہ ہے اور دریاے ذوق و حضور میں استغراق کی منزل ہے۔

۴۰۔۔۔۔۔ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ: یہ درجہ پہلے درجہ سے کم ہے۔ اس صورت میں بھی خوف و خشیت، حرکات و سکنات میں احتیاط، افعال و اعمال کی پوری رعایت اور ان کا حفظ

جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ ﴿الحديث﴾

۴۲۔۔۔۔۔ جملہ طاعات و عبادات کی تین منزلیں ہیں:

قضا واجب نہ ہو۔

رضا اور ثواب کے ترتیب کا سبب ہو۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ عبادت و بندگی کے ذوق سے باطن بھر پور ہو جائے۔

کے حضور میں مستغرق ہو جائے۔ نماز میں جو افضل عبادات اور اکمل قربات ہے، ذاتِ قدسیہ الہیہ سے ایک محاذاتِ معنوی حاصل ہے۔ باطن جس کی نورانیت سے منور ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت بغیر ذوقِ کامل نہیں حاصل ہو سکتی۔

دنیا میں مادی آلائشیں اور جسمانی حجابات، اس نعمت عظمیٰ سے محرومی کا سبب ہیں۔ جب یہ حجابات اٹھ جائیں گے تو کائنات کا تراہ انک تراہ ہو جائے گا، جیسا کہ آخرت کے ملامے میں واقع ہوا کہ:

سَتَرُونَ رَبِّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (الحديث)



۔۔۔۔۔ اسی لئے حدیث روایت میں یہ وصیت بھی کی گئی ہے کہ دن کی پہلی اور آخری نماز کی محافظت کی جائے۔ اسلئے کہ جنت میں رویت باری تعالیٰ کے یہی اوقات ہیں اور انہیں اوقات میں قوت بصیرت کو مشاہدہ جدیدہ سے نوازا جاتا ہے۔ لہذا ممکن ہے کہ ان وقتوں کی نمازوں کی محافظت، شہود ذات کا ملکہ، ہم پہنچائے اور رویت بصری میں استعداد و صلاحیت کامل طور پر پیدا کر دے۔

۴۴۔۔۔۔۔ دین کا مبنی اور اس کا کمال، فقہ، کلام اور تصوف پر ہے۔ اس حدیث شریف نے ان تینوں کو بیان فرمادیا۔ اسلام سے اشارہ فقہ کی طرف ہے جو تمام اعمال و احکام شرعیہ پر مشتمل ہے۔ ایمان سے اشارہ اعتقادات کی طرف ہے جو علم کلام کے مسائل ہیں۔ اور احسان سے اشارہ اصل تصوف یعنی 'صدق توجہ الی اللہ' کی طرف ہے۔ تصوف کے وہ جملہ معانی جن کی طرف مشائخ کرام نے اشارے فرمائے ہیں وہ سب اسی اصل کی طرف راجع ہیں۔

۴۵۔۔۔۔۔ یہ تینوں علوم ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں ان میں کوئی بھی اپنے غیر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا کیونکہ کلام بغیر تصوف اور تصوف بغیر فقہ کے حصول کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ حکم الہی بغیر فقہ پہنچانا نہیں جاسکتا اور فقہ بغیر تصوف مکمل نہیں ہو سکتی۔ اسلئے کہ عمل بغیر سچی اور کامل توجہ کے نامکمل ہے۔ اور دونوں یعنی فقہ و تصوف بغیر ایمان جو علم کلام کے مباحث سے ہیں، صحیح نہیں۔ اسکی مثال میں جسم و روح کے تعلق کو دیکھ لیجئے۔ ایک کا بغیر دوسرے کے وجود نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وہ کمال حاصل کر سکتا ہے۔

اسی لئے حضرت امام مالک علیہ رحمۃ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ يُصَوِّفْ وَلَمْ يَتَفَقَّهْ، فَقَدْ تَزَنَّدَقَ، وَمَنْ تَفَقَّهَ، وَلَمْ يَتَصَوَّفْ، فَقَدْ تَفَسَّقَ  
وَمَنْ جَمَعَ بَيْنَهُمَا فَقَدْ تَحَقَّقَ

۔۔۔۔۔ اسی کا نام کمال جامعیت ہے۔ اسکے علاوہ باقی کبھی اور بے راہ روی ہے۔

۴۶۔۔۔۔۔ فَخَابِرُنِي عَنِ السَّاعَةِ: احکام دین اور مقامات قرب و یقین کو واضح کر لینے کے بعد قیام قیامت کی طرف اشارہ اور اسکی علامتوں کی جانب تنبیہ فرمائی تاکہ التزام عبادت اور تحصیل کمال پر ابھارے۔

قیامت کو ساعت کہتے ہیں حالانکہ اس میں ایک طویل زمانہ ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ

۴۷۔۔۔ مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ: (یعنی بے تعلیم الہی بحساب عقل)

ہم دونوں قیام ساعت کے وقت کونہ جاننے میں برابر ہیں۔ بلکہ ہر سائل و سئول کا یہی حال ہے اسکو (بذاتہ) اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور نہ اللہ نے ملائکہ و رسل میں سے کسی کو اس کی اطلاع دی ہے (الامن الرضی عن رسول) یعنی ان کے سوا، جن کو اس نے اپنے رسولوں میں سے چن لیا ہے۔

۴۸۔۔۔ فَاخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا: اگر (آپ تعلیم و تبلیغ کیلئے) قیامت کے وقت کا

علم نہیں رکھتے تو اس کی علامتوں اور نشانیوں ہی کی نشاندہی فرما دیجئے۔

۴۹۔۔۔ اَنْ تَلِدَ الْاٰمَةُ رَبَّنَہَا: اس عبارت سے کیا مراد ہے۔ اس بارے میں

شارحین کرام کے مختلف اقوال ہیں۔

(۱)۔۔۔ اکثر شارحین کرام فرماتے ہیں کہ یہ اشارہ ہے کنیز بنانے کی کثرت اور

کثیر زادوں کے پیدا ہونے کی زیادتی کی طرف جو اپنی نسبت پداری کی جہت سے اپنی ماؤں کے معمولی اور سردار ہیں اور مالک کا حکم رکھتے ہیں۔ باعتبار اسکے کہ آدمی کے اموال اس کی موت کے بعد اس کی اولاد کی طرف راجع و سائر ہیں۔ بیابایں اعتبار کہ اولاد اپنے والد کے مال پر اسکی زندگی میں مقصر ہو جائیں گی۔ خواہ والد کے اذن صریح سے یا اسکے اشارے یا عرف و عادت کی وجہ سے۔ اس صورت حال مذکورہ کو قیامت کی علامت اسلئے فرمایا گیا ہے کہ دولت مندی اور آسودگی و تنعم کی کثرت کے سبب لوگ اسباب و آلات معیشت میں توسط و اعتدال کے دائرہ سے خارج ہو جائیں گے اور یہ بے اعتدالی احوال کے انتظام سے خروج و افساد و اختلال کا باعث اور ان کی طرف مفقعی ہوگا۔

یابایں جہت کہ قرب قیامت میں جہاد کی بے پناہ کثرت ہوگی اور اسیری و قید بندی کی کوئی انتہا نہ ہوگی، تو ہوسکتا ہے کہ اسی اثناء میں بعض اولاد اپنی ماؤں کو قید کر کے لائیں اور ان کے مالک بن جائیں اور اگر ظاہر نہ ہو کہ یہ ان کی ماں ہیں تو اس ملک پر دائم و مستمر رہیں اور اگر ظاہر ہو جائے تو وہ مائیں مملوکیّت سے آزاد ہو جائیں۔



یابائیں جہت کہ کثرت جہاد مسلمانوں کے بلا و کفر پر استیلاء اور اسلام کے غلبہ اور قوت اور اس کے کمال کا باعث ہے۔ اور جب ہر کمال کو زوال درپیش ہے تو پھر اسلام کا یہ کمال دولت اسلامیہ نے دور کے انقطاع اور انتہا کی طرف منجر و منہد ہے۔ اور یہ قیام قیامت یا۔۔۔۔۔ بایں ہمہ۔۔۔۔۔ کہ اولاد اپنی ماؤں کی بارگاہ میں سوء ادبی سے پیش آئیں گی اور ان کی نافرمانی کریں گی۔ اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ کریں گی جیسا کہ ایک آقا اپنے غلاموں کے ساتھ کرتا ہے۔

**سوال۔۔۔۔۔** کثرت جہاد اور بلا و کفر پر استیلاء آغاز اسلام میں بہت تھا۔ اور ظاہر یہ ہے کہ قیامت کی علامتیں آخری زمانہ میں ظاہر ہوں گی؟

**جواب۔۔۔۔۔** اول اسلام اپنے ماقبل کے اعتبار سے خود آخر زمان ہے تو اگر اسی وقت بعض علامات قیامت کا ظہور ہو جائے تو کوئی حیرت نہیں۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ شاید کہ اخیر زمانہ میں جہاد و استیلاء بیشتر سے بیشتر ہو۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

(ب)۔۔۔۔۔ بعض شارحین کا کہنا ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آخری زمانہ میں لڑکے اپنی ماؤں کی خرید و فروخت کریں گے۔ اسلئے کہ اس زمانے میں لوگوں کے احوال فاسد ہو جائیں گے اور وہ احکام کی رعایت نہ کر سکیں گے۔ اور حلال و حرام کو آپس میں ملا دیں گے تو ہو سکتا ہے کہ یہ مائیں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھوں میں ہوتی ہوئی پھر اپنے فرزندوں کے ہی ہاتھ لگیں اور مضمون اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رِبِّهَا صادق آئے۔

(ج)۔۔۔۔۔ بعض شارحین فرماتے ہیں یہ اس بات کی طرف کنایہ ہے کہ کینیریں بادشاہوں اور امراء کو جنس کی۔ تو جب یہ بادشاہ اور حاکم ہو گئے تو ان کی مائیں ان کی رعایا میں داخل ہو گئی اور یہ ان کے مالک و سردار بن گئیں۔ یہ بھی آخری زمانہ میں ظاہر ہو چکا۔ بالخصوص حکومت بنی عباس کے دور میں۔

**سوال۔۔۔۔۔** رہتھا: تائے تائیت کے ساتھ فرمایا گیا۔ تبہا نہیں ارشاد فرمایا حالانکہ تاویلات مذکورہ اثاث و ذکر سبھی کو شامل ہیں۔

**جواب۔۔۔۔۔** اس کا موصوف محذوف ہے اور وہ نفس ہے یا نسمة (نفس بمعنی آدمی و نفس) یہ دونوں لفظ مؤنث ہیں لیکن معنی ذکر و اثاث سبھی کو شامل ہیں۔ اللہ عز و جل کی شان

جلالت و عظمت کی تعظیم و اجلال کیلئے لفظ 'رب' کو اختیار فرما کر رہا نہیں کہا اگرچہ اضافت کے بعد اس لفظ کا اطلاق غیر خدا پر بھی جائز ہے یا کہ ربہ سے مراد لڑکی ہے تو جب لڑکیوں کا یہ حال ہوگا کہ وہ اپنی ماؤں کی نافرمان ہو جائیگی حالانکہ نسبتاً وہ لڑکوں سے کہیں زیادہ ماؤں کی اطاعت شعار ہوتی ہیں۔ تو لڑکوں کا یہ حال بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

۵۰۔۔۔ ایک روایت میں رہتہا کی جگہ بعلہا آیا ہے۔ بعل کے معنی بھی رب و سید کے ہیں۔ اور اگر اس کو زوج کے معنی میں لیا جائے جب بھی بعض توجہات مذکورہ اس پر بالکل صادق ہیں۔۔۔ مثلاً۔۔۔ کوئی کسی کنیز کو کفار کی قید میں سے لے آئے اور اس کو اپنی ماں نہ سمجھ سکے اور پھر اس سے نکاح کر لے اور فائدہ نکاح حاصل کرے۔

بعل کو زوج کے معنی میں لینے کی صورت میں اس قول کا بھی امکان ہے کہ چونکہ صدر اول میں لوگ کنیزوں سے اور لونڈیوں سے مباشرت ناپسند رکھتے تھے اور اس سے انکار و استنکاف کرتے تھے بخلاف اسکے حرائز (آزاد عورتوں) کو بہت پسند کرتے اور ان کی جانب رغبت رکھتے تھے۔ لہذا اس کے برعکس صورت حال کو قیامت کی نشانیوں میں شمار کرا دیا گیا جس میں آزاد عورتوں کے بجائے لونڈیوں کی طرف رغبت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ!

۵۱۔۔۔۔۔ يَنْطَلِقُوْنَ فِي الْبُكْيَانِ: یعنی فقر، باویہ نشین لوگ، جو ہمیشہ فقر و فاقہ، ذلت و رسوائی کی زندگی بیا بانوں میں بسر کرتے ہیں، اور عرب کے حقیر ترین مال یعنی بکریوں کو چراتے پھر رہے ہیں، معزز و معتبر ہوں گے۔ اور شہروں میں عالیشان کوٹھیاں بنوا کر اس میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔ یہ بھی قیامت کی علامت اور آخری زمانہ کی نشانی ہے۔ اسلئے کہ یہ مہمات عالم کی بے انتظامی اور اس میں اختلال کا موجب ہے۔ اور ذیلیوں، رذیلیوں اور جاہلوں کی عزت و بزرگی، باعث ہے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ اکابر علماء اور بلند مرتبہ حضرات کی حقارت و اہانت کا سبب ہے۔

شہنشاہ ذوالقرنین کے کارخانہ حکومت کی خوش انتظامی اور ان کے دور میں امن و امان سلامتی کا سبب یہی تھا کہ انہوں نے اپنے عہد حکومت میں ہر شخص کو اور ہر جماعت کو اسی حرفت صنعت پر لگایا اور وہی کام دیا جو 'ابا عن جد وراثہ' اس تک پہنچا تھا اور اس کے مناسب حال تھا کہ اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کو راہ نہ دیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک بہرہ ور لوگ اور خوش نصیب ترین حضرات رسوا اور احمق نہ شمار کئے جائیں۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ آیا ہے کہ علامات قیامت سے ہے کہ نیک لوگ پست وزیوں حال ہو گئے اور برے لوگ بلند وغالب۔

۵۲۔۔۔۔۔ قیامت کی چھوٹی بڑی علامتیں بہت ہیں جیسا کہ انشاء اللہ باب ’اشرار الساعۃ‘ میں آئے گا، لیکن سرکار رسالت نے انہیں دو پر اقتصار فرمایا۔ شاید کہ مقام کا اقتضاء یہی رہا ہو۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ!

۵۳۔۔۔۔۔ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا؛ تو پریشانی نے کہا کہ ’ساعت طویلہ‘ مراد ہے۔ یعنی درازی و کوتاہی امر نہی ہے۔ اس قسم کے عجیب و غریب واقعہ میں اقتضائے حال اور مقتضائے طبیعت یہی تھا کہ سوال و استفسار میں غفلت سے کام لیا جاتا۔ ایسی صورت میں قلیل و تصیر زمانے کا صبر کثیر و طویل محسوس ہوتا ہے۔

۵۴۔۔۔۔۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ ہے ’آئے والا مڑ کر چلا گیا‘ تو آنحضرت ﷺ نے سامعین سے فرمایا کہ اس کو واپس لوٹا لاؤ۔ لوگ لوٹانے کیلئے گئے لیکن کسی کو نہ دیکھ سکے۔

۵۵۔۔۔۔۔ اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ اَعْلَمُ؛ یہ جملہ حضرات صحابہ کرام کا طریقہ ادب تھا کہ جب کبھی سرکار رسالت ان سے استفہام و استعلام کرتے، وہ یہی عرض کرتے اور اپنے ادب و دانش کا کامل ثبوت دیتے۔

۵۶۔۔۔۔۔ هٰذَا جِبْرِيلُ؛ جبریل سریانی نام ہے۔ اس کے معنی عبد اللہ ہیں اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ حضرت جبریل کی طرف تعلیم کی اسناد اسلئے ہے کہ وہ اسی لئے مبعوث کئے گئے تھے کہ سوال کر کے رسول کریم کے جواب کو سارے حاضرین مجلس کو سنائیں۔ جب حضرت جبریل حامل وہی اور مبلغ علم ہیں تو تعلیم کی نسبت ان کی طرف غیر حقیقی نہیں، بلکہ حکم حقیقی رکھتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا کہ احکام پہلے سے۔۔۔۔۔ معلوم تھے اور مقصود صرف تذکیر اور تجدید علم تھا۔ اس مقام نے یہ ظاہر کر دیا کہ دین اسلام و ایمان و احسان کے مجموعہ کا نام ہے اور شریعت بھی اسی مجموعہ کا نام ہے۔

لیکن کبھی کبھی دین کا اطلاق صرف اسلام پر ہوتا ہے مثلاً: اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ السَّلَامُ اور شریعت کا صرف احکام فرعیہ فقہیہ، پر جیسا کہ شریعت، طریقت، حقیقت کہتے ہیں۔ یہ تینوں بھی دین ہی کے اجزاء اور اس کی شاخیں ہیں۔۔۔۔۔ الحاصل۔۔۔ دین ایک ہی ہے جو دو نہیں ہوتا۔ اور جو کوئی اس کے سوا سمجھے وہ خطا پر ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ!

۵۷۔۔۔۔۔ رواہ مسلم: حدیث شریف بخاری نے بھی روایت کی ہے، لیکن حضرت عمر سے نہیں۔ لہذا ارباب اصطلاح کے نزدیک یہ حدیث متفق علیہ نہ کہی جائیگی۔ اسی حدیث شریف کو کچھ لفظی تغیر کے ساتھ بخاری و مسلم دونوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔ ۵۸۔۔۔۔۔ ثُمَّ قَرَأَ: تاکہ ان پانچ چیزوں کا بیان اور اسکی تعیین ہو جائے جس کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۵۹۔۔۔۔۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ۔۔۔۔۔ الخ: آخر آیت تک یعنی وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ط وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ اَرْضٍ تَمُوتُ ط ﴿سورۃ العنکبوت ۳۳﴾ یقیناً خدا تعالیٰ ہی کو قیامت کا علم ہے اور وہی جانتا ہے کہ بارش کب ہوگی اور حاملہ کے شکم میں کیا ہے لڑکا یا لڑکی؟ کسی نفس کو یہ خبر نہیں کہ کل وہ کیا کرے گی اور نہ یہی جانتی ہے کہ کس زمین پر اس کی موت ہوگی۔

۔۔۔۔۔ مراد یہ ہے کہ بے تعلیم الہی بحساب عقل کوئی شخص ان کو نہیں جانتا۔ اسلئے کہ یہ سارے کے سارے علوم غیب سے ہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کو وحی یا الہام کے ذریعہ باخبر فرما دے۔ ۱۔۔۔۔۔ ابھی تک جو اہر پارے کے عنوان کے تحت جو کچھ تحریر کیا گیا ہے وہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی تالیف ’امعة الممعات‘ سے ماخوذ ہے۔

۲۔۔۔۔۔ مسلم شریف میں ہے کہ ایک دن حضور آپیہ رحمت ﷺ نے فرمایا ’سلوئی‘ یعنی مجھ سے دین کی باتیں پوچھ لو۔۔۔۔۔ فہا بوان یسئلوہ۔۔۔۔۔ تو صحابہ کرام سوالات کیلئے تیار ہی ہوئے تھے کہ حضرت جبرئیل بارگاہ عالی میں حاضر ہو کر سوالات عرض کرنے لگے۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ حضرت جبرئیل کی بارگاہ نبوت میں حاضری تعلیم و تذکیر کے سوا اسلئے بھی تھی تاکہ لوگ

بارگاہ نبوی میں حاضری کے آداب اور آپ سے سوال کرنے کا طریقہ سیکھ لیں۔

۳۔۔۔ ابن مندہ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس اثناء میں کہ سرکارِ دو عالم وعظ فرما رہے تھے کہ بصورت انسان حضرت جبرئیل اچانک حاضر بارگاہ ہوئے اور سوالات عرض کرنے لگے۔ اس روایت کی روشنی میں بھی سیدنا جبرئیل کی حاضری کا مقصد تعلیم و تذکیر کے سوا۔۔۔ وہ بھی تھا جس کی طرف ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ دونوں روایتوں میں توفیق کی صورت ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ سرکارِ دو عالم وعظ فرما رہے تھے۔ پھر درمیان وعظ میں ارشاد فرمایا 'سلوئی' مجھ سے سوال کرو۔ یہ فرمانا تھا کہ حضرات صحابہ کے سوال عرض کرنے سے پہلے ہی حضرت جبرئیل حاضر بارگاہ ہو گئے۔

۴۔۔۔ بخاری شریف کے الفاظ یہ ہیں:

تَمَنَّيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَارَئًا قَوْمًا لِلنَّاسِ فَأَتَاهُ رَجُلٌ

یعنی۔۔۔ نبی کریم ﷺ ایک دن مجمع صحابہ میں ظاہر ہوئے تو ایک شخص آپ کے حضور حاضر ہوئے۔۔۔ ان تمام روایات میں صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے کسی نے واقعہ کی نسبتاً زیادہ تفصیل کی ہے اور کسی نے صرف اجمال سے کام لیا ہے۔

۵۔۔۔ ابو داؤد کی ایک روایت کا حاصل ہے کہ سرکارِ مدینہ اپنے اصحاب کی جہر مٹ میں جلوہ افروز تھے۔ تو جب کوئی انہی مسافر بارگاہِ حالی میں حاضر ہوتا تو وہ پہچان نہ پاتا کہ ان میں رسولِ عربی کون ہیں؟ اور کس کی بارگاہ میں وہ اپنا معروضہ رکھے۔ ان حالات کے پیش نظر صحابہ کرام نے سرکارِ مدینہ سے مطالبہ کیا کہ ہم لوگوں کیلئے بیٹھنے کی ایک جگہ متعین کر دی جائے تاکہ آنے والے مسافر کو آپ کے پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔ سرکارِ رسالت نے اس عرض کو قبول فرمالیا۔ تو صحابہ کرام نے آپ کی اجازت سے آپ کے تشریف رکھنے کیلئے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا جس پر آپ جلوہ افروز رہتے اور صحابہ کرام آپ کے پہلو میں چبوترے کے نیچے بیٹھتے۔

۶۔۔۔ امام قرطبی نے اسی روایت سے اسی مسئلہ کا استنباط فرمایا ہے کہ عالمِ دین کیلئے بلند اور مخصوص جگہ پر ضرورتاً بیٹھنا مسنون ہے۔ یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ حضرت جبرئیل جب بارگاہِ رسالت میں سوالات عرض کرنے کیلئے حاضر ہوئے تھے، سرکارِ اس وقت ایک بلند اور ممتاز مقام پر جلوہ افروز



تھے۔ ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ سرکار رسالت کی عمر شریف کے آخری ایام میں پیش آیا۔ جبکہ جملہ احکام کا نزول ہو چکا تھا۔

ایک قول کے مطابق حجۃ الوداع سے کچھ پہلے ۱۰ھ میں یہ واقعہ پیش آیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں حضرت جبرئیل کے آنے، سوالات کرنے اور جوابات حاصل کرنے میں یہی حکمت نظر آتی ہے کہ دین کی جو اصولی باتیں صحابہ تک متفرق طور پر زبان رسالت مآب کے ذریعہ پہنچی ہیں، وہ ساری باتیں سرکار رسالت کی زبان فیض ترجمان کے ذریعہ ایک ساتھ ایک ہی مجلس میں ان کو پھر سنوایا جائے تاکہ وہ ان امور کو خوب خوب ذہن نشین فرمائیں اور ان امور کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور بقول علامہ قسطلانی علیہ الرحمۃ: حضرات صحابہ کرام کو یہ بھی معلوم ہو جائے (یعنی ان کے اس علم کی تجدید ہو جائے) کہ حضور آیت رحمت ﷺ علم و معرفت کا خزینہ ہیں اور شاید یہ بھی اشارہ ہو کہ سرکار رسالت نے دین کے جملہ امور کو منفرداً تو ظاہر ہی فرمادیا تھا اور آج مجتمعاً بھی سب کو پیش فرمادیا۔۔۔۔۔ الاصل۔۔۔۔۔ جو کچھ امت کے سامنے پیش کرنا تھا پیش کیا جا چکا۔ سرکار رسالت اپنے فریضہ نبوت سے سبکدوش ہو چکے اب کچھ ہی دنوں کے بعد ’محبوب حقیقی‘ کی بارگاہ قدس سے پیغام وصال آنے والا ہے۔

۷۔۔۔۔۔ اُزْطَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ: اس فقرہ میں کمال نورانیت کے ساتھ ظہور کی تعبیر لفظ طلوع سے کی گئی ہے جس سے آنے والے کی عظمت شان و علو مرتبت کا اظہار ہوتا ہے۔

۸۔۔۔۔۔ حضرت جبرئیل نوری ہیں مگر لباس بشری میں حاضر دربار ہوئے تاکہ حاضرین کو ان سے کمال انس پیدا ہوا سلائے کہ جنس اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے۔ لباس بشری میں آنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ:

لَا طَاقَةَ الْبَشَرِ عَلَى رُؤْيَةِ الْمَلَكِ (جلالین)

بشر میں ملائکہ کی اصل صورت دیکھنے کی تاب نہیں۔

۔۔۔۔۔ وہ خیر البشر کی ہی قوت بصارت ہے جس نے روایت صحیحہ کے مطابق حضرت جبرئیل کو ان کی اصل شکل میں دوبار دیکھا۔

بشر ضرور ہیں پر داخل انا ہم نہیں  
شمار دانہء تسبیح میں امام نہیں

۹۔۔۔ حضرت جبرئیل کے آدمی کی صورت میں آنے سے یہ بھی پتہ چلا کہ اللہ نے اپنے فرشتوں کو اپنے فضل و کرم سے وہ قدرت دی ہے جس سے وہ مختلف صورتوں میں متشکل و متمثل ہو سکیں۔

۱۰۔۔۔ حضرت جبرئیل ایک نہایت حسین و جمیل صحابی، حضرت وحیہ کلبی کی شکل میں حاضر دربار ہوتے تھے۔ مگر حدیث زیر بحث کے اس فقرہ۔ 'وَالْبَعْرُفَةُ مَنَاحِدُ' درال حالانکہ ہم میں سے انہیں کوئی پہچان نہیں رہا ہے، سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل اس دن حضرت وحیہ کلبی کی صورت میں نہ تھے، ورنہ لوگ انہیں ضرور پہچان لیتے۔۔۔۔۔ الحاصل۔۔۔۔۔ نسا کی روایت میں جو یہ آگیا ہے کہ حضرت جبرئیل اس دن بھی حضرت وحیہ کلبی ہی کی صورت میں حاضر ہوئے تھے، اسے راوی کے وہم پر محمول کیا جائے گا۔ وہم کا سبب یہ ہے کہ حضرت جبرئیل اکثر و بیشتر حضرت وحیہ کلبی ہی کی صورت میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوتے تھے تو راوی نے خیال کر لیا کہ شاید یہ اس دن بھی اسی صورت میں آئے ہوں۔

۱۱۔۔۔ حضرت جبرئیل آدمی کی شکل و صورت میں آئے۔ آدمیوں کی طرح لباس میں ملبوس تھے اور بظاہر ایک آدمی کے ظاہری اوصاف و اطوار کے حامل تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عمر نے بھی ان کو رُجل ہی فرمایا۔ جس کا معنی آدمی ہے۔

روایت حدیث اس پورے واقعہ اور اس امر کی وضاحت کے بعد کی چیز ہے کہ وہ آنے والے 'ملک' تھے اور 'رُجل' نہ تھے۔۔۔۔۔ بایں ہمہ۔۔۔۔۔ راوی حدیث نے روایت کے وقت وہی کہا جو نگاہوں سے دیکھا اور ایک 'ملک' کو لفظ 'رُجل' کا مصداق ٹھہرا دیا۔ 'ملک' کو 'رُجل' کہنے۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ ملک کا صورت انسانی میں آنے کی یہ کوئی ایک مثال نہیں، بلکہ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ رسول کریم کے حضور میں حضرت جبرئیل جب وحی لے کر حاضر ہوتے تو صورت انسانی ہی میں حاضر ہوتے۔ اسلئے کہ وحی کی نشاندہی حدیثوں میں کی گئی ہے۔

(۱)۔۔۔ مِنْ قُلُوبِهِمْ صَلَٰةُ الْمَلَكِ (گھڑیال کی آواز کی طرح)

(۲)۔۔۔ اَخْبَانَا فَمَقُلْ لِي الْمَلِكُ رَجُلًا (کبھی فرشتہ میرے رو برو آدمی کی شکل میں آتا)

۔۔۔۔۔ وحی کو جوان دو کیفیتوں میں محصور کیا گیا ہے تو اس سے حصر حقیقی مراد نہیں بلکہ حصر اضافی ہے۔ وحی کی اس دوسری کیفیت نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ ملک کا صورت انسانی



میں آنا اور پھر اس پر لفظ رجل کا اطلاق کیا جانا معروف و متعارف ہے۔

حضرت مریم کے پاس بھی جب حضرت جبریل آئے تو انسانی صورت ہی میں آئے تھے۔ قرآن کریم میں ان کیلئے بُشْرَآسَوِيًّا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر باوجود اس کے کسی نے بھی ظاہری صورت بشری میں مماثلت کے سبب حضرت جبریل کو اپنی طرح۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ اپنے کو حضرت جبریل کی طرح نہیں کہا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی عقول کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ ایک فرشتہ صرف دو چار برس تک ہی نہیں بلکہ ایک لاکھ برس تک آدمی کی شکل و صورت میں رہ کر بشری لوازمات کو اپنائے رہے، پھر بھی اس کی حقیقت ملکوتی پر آنچ نہیں آسکتی اور وہ بہر حال نوری مخلوق ہی رہے گا۔

لباس بدلنے سے حقیقت نہیں بدلا کرتی لہذا کسی بشر کو حق نہیں کہ کسی فرشتہ کو اگر صرف چہرہ مہرہ رکھنے میں اپنے روپ میں پائے تو اس کو بالکل اپنا جیسا ہی کہنے لگے۔ اور اس کی حقیقت نوری کا منکر ہو جائے۔

یہ خیال رہے کہ صورت بشری میں آنے کے بعد کسی ملک کو رجل یا بشر کہنا یہ ایک الگ چیز ہے اور اس کو اپنی طرح تصور کرنا، یہ ایک دوسری چیز۔ دونوں صورتوں میں عظیم فرق ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر کیا عقل انسانی یہ فیصلہ نہ کرے گی کہ جب حضرت جبریل بالفرض ایک لاکھ برس تک صورت بشری میں رہنے کے باوجود نوری ہی رہتے ہیں، اور ہماری طرح نہیں ہو جاتے، تو پھر اگر کوئی نوری مخلوق جس کی نورانیت قَدْ جَاءَتْكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ سے ثابت اور اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورِي سے ظاہر ہے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ کثیر نصوص اس کی نورانیت پر شاہد ہیں، صرف ۶۳ برس کی صورت بشری میں ہمارے روبرو رہے تو اس کی حقیقت نوری ہرگز نہیں بدل سکتی۔ اس کو بشر تو کہا جائے گا، ظاہر صورت بشری میں وہ ہمارے مسائل بھی نظر آئے گا، مگر بایں ہمہ اس کو اپنا جیسا نہیں کہا جاسکتا اور نہ اس کی حقیقت نوری کا انکار کیا جاسکتا ہے۔

۱۲۔۔۔۔۔ شَدِيدٌ يَبَاضُ الْفَيْتَابِ (کپڑے انتہائی سفید) اس سے اشارہ ملتا ہے کہ سفید کپڑوں کا استعمال۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ کپڑوں کو نہایت صاف ستھرا رکھنا مستحب و مستحسن ہے۔

۱۳۔۔۔۔۔ شَدِيدٌ سَوَادِ الشُّعْرِ (بال بہت ہی کالے) بال کا شدید کالا ہونا نوجوانی

کی علامت ہے۔ حضرت جبرئیل کا نوجوان کی صورت میں آنا اشارہ کر رہا ہے کہ طلب علم کیلئے بہتر زمانہ آغاز شباب کا زمانہ ہوتا ہے۔ اسلئے کہ اس زمانہ میں علم کے گرانقدر بوجھ کے اٹھانے اور اس کی ادائیگی کو بحسن و خوبی برداشت کرنے کی انسان میں پوری قوت ہوتی ہے۔ فکر و نظر کے سارے دریچے کھلے رہتے ہیں اور ظاہری و باطنی نطق کی ساری توانائیاں تازہ دم رہتی ہیں۔

فائدہ نمبر ۱۸ کے تحت مسند امام احمد اعظم کی روایت آرہی ہے جس میں اس بات کی تصریح ہے کہ سیدنا جبرئیل ’جامہ شباب‘ پہن کر حاضر ہوئے تھے۔ خیال رہے کہ عربی زبان میں شباب کا اطلاق بلوغ سے تیس برس تک کے زمانہ پر ہوتا ہے۔

۱۴۔۔۔ سفید رنگ چونکہ تمام رنگوں میں بہتر رنگ ہے اس کی سادگی میں جو پرکاری ہے وہ دوسرے رنگوں کو نصیب نہیں، اسلئے اس کے ذکر کو مقدم کر دیا۔ تقدیم کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ ایک بارگی شدید ترین سیاہ رنگ کا ذکر سننے والے۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ سننے والے کے طبع لطیف کو متوحش کر سکتا تھا۔ لہذا اس کو مؤخر کر دیا۔ اب کپڑے کی پاکیزگی و نظافت کے ذکر کے بعد بال کی سیاہی کا ذکر وحشت کے بجائے محبت پیدا کرے گا اور نگاہوں کے سامنے حسن و جمال کے ایک مجسمہ کی تصویر کشی کر دے گا۔

۱۵۔۔۔ ابن حبان کی روایت ہے۔ ’مَشْدِيدٌ مَوَادِّ اللَّحْبَةِ‘ یعنی نہایت سیاہ دائرہ۔ اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ کس جگہ کے بال کی سیاہی کا ذکر حدیث کے راوی نے کیا ہے۔

۱۶۔۔۔ ابوالفہا کل علی بن عبد اللہ بن احمد مصری معروف بزمین العرب نے اپنی شرح مصابیح میں فرمایا ہے کہ حدیث زیر بحث میں جو یہ ہے کہ ہم میں سے کسی نے نہیں پہچانا، اس سے مراد صرف صحابہ کرام ہیں۔ یعنی صحابہ کرام میں سے جو حاضرین تھے ان میں سے کسی نے نہیں پہچانا۔ رہ گئے سرکار رسالت تو آپ پہلے ہی پہچان چکے تھے۔ میرے خیال میں حضرت زین العرب کی بات قرین قیاس بھی ہے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ روایت زیر بحث ہی سے اسکی تائید بھی ہوتی ہے اسلئے کہ اگر سرکار رسالت ہی نے نہ پہچانا ہوتا تو بروایت مسلم حضور یہ کیسے ارشاد فرماتے کہ:

هَذَا جِبْرِيلُ، اَتَاكُمْ بِمَلَكُمْ دِينَكُمْ

۔۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔۔ یہ جبرئیل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے

--- یا بروایت بخاری یہ کیسے فرماتے:

هَذَا جِبْرِيلُ جَاءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِينَهُمْ

یعنی --- یہ جبرئیل تھے جو لوگوں کو ان کا دین سکھانے کیلئے آئے تھے

--- عدم معرفت کے سبب صحابہ کو جو حیرانی تھی، حضور ہی نے تو پہچان کر اے اس حیرانی کو دور

فرمایا، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ پہچان کرانے والا خود نہ پہچانے۔

’تسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض‘ (جلد ۳) میں ہے:

أَلَا نَبِيَّةَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ مِنْ جِهَةِ الْإِنْسَانِ وَالْطَّوَاهِرُ مَعَ الْبَشَرِ

وَبَوَاطِنُهُمْ وَقَوَائِمُ الرُّوحَانِيَّةِ - مَلَائِكَةُ وَلَدَاتِ مَشَارِقِ الْأَرْضِ وَمَغَارِبِهَا

وَتَسْمَعُ أَطْيَقَ السَّمَاءِ وَتَنْشُمُ رَائِحَةَ جِبْرِيلَ إِذَا أَرَادَ النُّزُولَ عَلَيْهِمْ ط

’انبیاء علیہم السلام ظاہری اجسام کے اعتبار سے بشر کے ساتھ ہیں، یعنی جامعہ بشریت میں

ہیں، لیکن ان کا باطن اور ان کی روحانی قوتیں ملکی ہیں، یعنی ملکوتی شان رکھتی ہیں اسلئے وہ زمین کے

تمام مشارق و مغارب کو دیکھتے ہیں، یعنی زمین کا کوئی گوشہ ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اور

اپنے کانوں سے آسمان کی چڑچڑاہٹ کی آواز سماعت فرماتے ہیں۔ نیز ان کی قوت شامہ کا یہ عالم

ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل سدرۃ المنتہی کی بلند یوں سے جیسے ہی ان پر نازل ہونے کا ارادہ کرتے

ہیں یہ حضرت جبرئیل کی خوشبو محسوس کر لیتے ہیں۔‘

--- ایسی صورت میں سید الانبیاء سے متعلق یہ خیال کس قدر باعث استعجاب ہوگا کہ حضرت

جبرئیل سدرہ پر نہیں بلکہ آپ کے سامنے ہی حاضر ہو کر سوالات عرض کریں۔۔۔۔ اور آپ ان کو

پہچان نہ سکیں۔

اس مسئلہ پر یوں بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ خدا اور رسول کے مابین وحی کی جتنی صورتیں ہیں

ان میں ایک صورت واسطہء جبرائیل بھی ہے۔ اب اگر اس بات کا امکان تسلیم کر لیا جائے کہ ہو

سکتا ہے کہ بعثت کے بعد بھی رسول حضرت جبرئیل کو پہچان نہ سکیں، جسکی تین صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ غیر جبرئیل کو جبرئیل سمجھ لیں۔

دوسرے یہ کہ جبرئیل کو غیر جبرئیل تصور کر لیں۔

تیسرے یہ کہ ترقود میں رہیں اور کوئی فیصلہ ہی نہ کر سکیں کہ یہ جبرئیل ہیں یا کوئی اور۔

۔۔۔۔۔ پھر تو۔۔۔۔۔ وہ سارے دفاتر، جو بواسطہ سیدنا جبرئیل حضرات رسل کرام کو ملے سب مشکوک ہو جائیں گے۔ اور خدا کی طرف سے ان کا ہونا ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اسلئے کہ یہ احتمال تو ہر حال میں دامن گیر رہے گا کہ ہو سکتا ہے کہ خدا کے رسول نے جس کو جبرئیل سمجھا وہ ’غیر جبرئیل‘ رہے ہوں۔۔۔۔۔ حامل وحی کی ’معرفت‘ اللہ کے رسول کیلئے لازمی و ضروری نہ ہونے کی صورت میں خود رسول بھی تو مشکوک رہیں گے کہ میری بارگاہ میں حاضر ہونے والے ’حامل وحی‘، خدا جانے جبرئیل ہی ہیں یا کوئی دوسرا ان کا روپ دھار کے آگیا ہے۔ پھر اس وحی کا ہمارے لئے ’وحی الہی‘ ہونا کسی طرح قابل یقین ہو سکتا ہے، جبکہ ہمارا رسول ہی مشکوک نظر آ رہا ہو۔۔۔۔۔ المختصر۔۔۔ عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ خدا کے ہر ایک رسول کیلئے بعثت کے بعد حضرت جبرئیل کی کامل معرفت لازمی و ضروری ہے۔ وہ بھی ایسی معرفت جس میں کبھی اک آن کیلئے بھی کسی اشتباہ کا گذر تک نہ ہو۔ ان مباحث کی ضرورت صرف اسلئے پیش آئی تاکہ ان روایات کا ناقابل قبول ہونا ظاہر ہو جائے جن میں صراحت مذکور ہے کہ غائب ہونے سے پہلے خود سرکار رسالت بھی نہیں پہچان سکے کہ جن سے سوال و جواب ہو رہا تھا وہ حضرت جبرئیل تھے۔

ان روایات کی طرح شیخ ابن حجر عسقلانی نے بھی اپنی شرح بخاری میں اشارہ فرمایا ہے ۔۔۔۔۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ جب حضرت جبرئیل بارگاہ رسالت میں حاضر تھے اور آپ سے غایت موافقت کے سبب اتنے قریب تھے کہ زانو سے زانو ملے ہوئے تھے، اور ایک روایت کے مطابق سرکار کی مبارک رانوں پر حضرت جبرئیل نے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دئے تھے، ایسی صورت میں تو حضور ان کو نہ پہچان سکے اور جب وہ غائب ہو گئے تو پہچان لیا۔ طوالت تحریر کا خوف نہ ہوتا تو میں ظاہر کر دیتا کہ حضور آیہ رحمت ﷺ کی سماعت و بصارت اور علم و معرفت کا عالم کیا تھا اور یہ بھی ظاہر کرویتا کہ سرکار رسالت کے ارشاد گرامی:

’إِنِّي أُرَٰى مَا لَا تَرَوْنَ وَأَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُونَ‘

میں وہ دیکھتا ہوں جسے تم نہیں دیکھتے اور میں وہ سنتا ہوں جس کو تم نہیں سنتے

۔۔۔۔۔ کی تشریحی کائنات کتنی وسیع ہے؟۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ ترمذی داہن بلجہ اور ابو نعیم کی اس حدیث سے کس قدر وسیع بلکہ وسیع تر آپ کے دائرہ سماعت و بصارت کی نشاندہی ہوتی ہے؟ اس

کی وسعت کا عالم کسی نہ کسی قدر علامہ بوضیری کے اس مصرع سے سمجھا جاسکتا ہے۔

وَمَنْ غُلُومِكَ عِلْمَ اللُّوحِ وَالْقَلَمِ

اے میرے رسول آپ کے علم پاک کا عالم یہ ہے کہ

لوح و قلم میں جو کچھ ہے وہ آپ کے علوم کا بعض ہے۔

فائدہ نمبر ۹۱ کے تحت شیخ ابن حجر کی اشارہ کردہ مذکورہ بالا روایات کے مفاہیم کی تعیین

سے متعلق چند باتیں آرہی ہیں۔

۷۔۔۔۔۔ وَلَا يَعْرِفُهُ، مِّنْ آخِلِهِ، (در انحالیکہ ہم میں سے کوئی اسے پہچان نہیں رہا

(ہے) حاصل مراد یہ ہے کہ۔۔۔ اس کے آنے کی کیفیت سے ہم تعجب میں پڑ گئے۔ اور اس تردد

میں مبتلا ہو گئے کہ آیا یہ کوئی فرشتہ ہے یا جن۔ اسلئے کہ اگر اسی شہر کے کوئی آدمی ہوتے، تو ہم ضرور

پہچان لیتے۔ اور اگر مسافر ہوتے تو سفر کے آثار کا ظہور چہرہ وغیرہ سے ضرور ہوتا۔

اس مقام پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر کو کیسے پتہ چلا کہ صحابہ میں سے کسی ایک

نے بھی انہیں نہیں پہچانا؟۔۔۔۔۔ اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ظن غالب سے

جو سمجھا اس کا اظہار فرما دیا۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ تنہا حضرت عمرؓ ہی نہیں پہچان سکے بلکہ ان کے

گمان غالب میں آنے والے کو کوئی صحابی بھی نہیں پہچان سکا۔۔۔ مگر۔۔۔ اس سے بہتر جواب

یہ ہے کہ اسی مجلس میں حاضرین صحابہ میں سے ہر ایک نے صراحتاً اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ

ہم آنے والے کو نہ پہچان سکے، جس کی روایت حضرت عمرؓ نے عمر کر دی۔۔۔ اس آخری جواب کو

عثمان بن غیاث کی روایت سے تائید بھی ملتی ہے۔ اس روایت میں ہے:

فَنَظَرَ الْقَوْمُ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ فَقَالُوا مَا نَعْرِفُ هَذَا

قوم کے ہر فرد نے ایک دوسرے کو دیکھ کر کہا کہ ہم ان کو نہیں پہچانتے۔

۔۔۔ شیخ ابن حجر عسقلانی نے ایسا ہی فرمایا ہے۔

۱۸۔۔۔۔۔ حَتّٰی جَلَسَ۔۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔۔ مسند امام اعظم کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے

کہ حضرت جبرئیل بارگاہ رسالت میں حاضر ہونے سے پہلے اذن ہار یا بی حاصل کرتے ہیں اور

جب سرکارِ دو عالم اجازت عطا فرمادیتے ہیں تو حاضر دربار ہو جاتے ہیں۔ مسند کے کلمات یہ ہیں:

عن حماد عن علقمة عن ابن مسعود



قَالَ جِبْرِيلُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
فِي صُورَةِ شَبَابٍ عَلَيْهِ ثِيَابٌ بَيَاضٌ فَقَالَ -  
حماد بن علقمة عن ابن مسعود نے فرمایا کہ حضرت جبریل  
بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے جامدہ شباب  
میں سفید لباس میں ملبوس پھر عرض کیا -

السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيْكَ السَّلَامُ  
فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ادْنُوا فَقَالَ ادْنُ  
السلام علیک یا رسول اللہ سرکار نے جواب دیا وعلیک السلام تو حضرت  
جبریل نے عرض کیا - میں آپ کے قریب آسکتا ہوں سرکار نے  
اپنے قریب آنے کی اجازت دیدی اور فرمایا قریب آ جاؤ -

فائدہ نمبر ۱۳ کے تحت تصریح کی جا چکی ہے کہ عربی زبان میں بلوغ سے لیکر تیس برس  
تک کا زمانہ شباب کا زمانہ کہلاتا ہے، اسلئے شباب اگر جوان کو کہہ سکتے ہیں تو جوان کو بھی کہہ  
سکتے ہیں۔۔۔ الخضر۔۔۔ فائدہ نمبر ۱۳ کے تحت بعض قرائن کے پیش نظر مرقعات سے اخذ کرتے  
ہوئے جو یہ کہا گیا ہے کہ حضرت جبریل نو جوان کی صورت میں آئے تھے وہ اس روایت سے  
متصادم و متعارض نہیں۔

۱۹۔۔۔۔۔ حَتَّى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
حَتَّى بَرَكَ بَيْنَ يَدَيْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
كَمَا يَجْلِسُ أَحَدُنَا فِي الصَّلَاةِ

ایک روایت میں ہے (یعنی حضرت جبریل قریب ہو کر)  
نبی کریم ﷺ کے سامنے ایسا بیٹھے جیسے کوئی نماز کیلئے بیٹھتا ہے۔  
۔۔۔ یعنی، جلد اول میں سلیمان بھی کی مذکورہ روایت کا آخری فقرہ یوں ہے:

كَمَا يَجْلِسُ أَحَدُنَا فِي الصَّلَاةِ  
جیسے نمازی نماز میں بیٹھتا ہے۔

اس روایت سے اس خیال کی زبردست تائید ہوتی ہے کہ حضرت جبریل اپنے ہاتھوں کو  
اپنی ہی رانوں پر رکھ کر بیٹھے تھے جس طرح کہ ایک متعلم اپنے معلم کے سامنے باادب بیٹھتا ہے:

۲۰۔۔۔۔۔ فَأَسْنَدَ رُجُلَيْهِ إِلَى رُجُلَيْهِ

اپنے دونوں زانوؤں کو آنحضرت کے زانوؤں سے ٹک دیا

وائیں بائیں بیٹھنے کے بجائے، سامنے مؤدبانہ دوزانو بیٹھنا تو واضح ادب کی شاندار مثال ہے۔ زانو کو زانو سے ملا دینے سے صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت جبریل کو سرکار رسالت سے کمال محبت اور غایت موانست تھی بلکہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت جبریل اس وقت اس سائل کی طرح نظر آ رہے تھے جو اپنے سوال کا جواب سننے کیلئے سبقت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور کامل طور گوش بر آواز۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ حاضر دماغ نظر آتا ہے۔ نشست کی یہ ہیئت اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ سائل اپنے سوالات کے جوابات کا شدید محتاج ہے اور ظاہر ہے کہ اس احتیاج کو سمجھ لینے کے بعد مسئول کی فوری اور کامل توجہ سائل کی طرف ہو جاتی ہے۔

۲۱۔۔۔۔۔ وَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى فَخْذَيْهِ

اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اپنی رانوں پر رکھ دیا۔

نسائی میں ہے کہ آنے والے نے اپنے دونوں کف دست کو آنحضرت ﷺ کی دونوں رانوں پر رکھ دیا۔ اس طرح غایت قرب کی ایک وجہ وہ ہو سکتی ہے، جس کی طرف فائدہ نمبر ۲۰ کے تحت اشارات گزر چکے ہیں۔ اور دوسری وجہ وہ ہو سکتی ہے جس کو مفصل طور پر ’احمد المصنوعات‘ سے اخذ کرتے ہوئے حدیث زیر بحث کے جواب پر پارے نمبر ۵ کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ چونکہ حضرت جبریل نے آنحضرت ﷺ سے اتصال و قرب میں مبالغہ فرمایا تھا اور اپنے کو سرکار کے حضور جھکا دیا تھا۔ تو کچھ دور پر بیٹھنے والا یہ محسوس کر سکتا ہے کہ حضرت جبریل نے اپنی ہتھیلیوں کو اپنی رانوں کے بجائے سرکار ہی کی مبارک رانوں پر رکھ دیا ہے۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ حضرت جبریل نے اپنی ہی رانوں پر ہتھیلیاں رکھی ہوں۔۔۔۔۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ!

۲۲۔۔۔۔۔ عِلْمُهُ شَدِيدُ الْقُوَى: وَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى فَخْذَيْهِ کے تحت، حضرت شیخ

محقق نے اشارہ فرمایا ہے کہ تعلیم کی اسناد سیدنا جبریل کی طرف ہے۔

اس سلسلے میں بعض متحققین کی تصریحات یہ ہیں کہ ’شدید القوی‘ حق تعالیٰ ہے، سیدنا جبریل نہیں۔ اسلئے کہ مَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ کی علت علمہ ہے ورنہ ان دونوں آیتوں میں کوئی ربط نہ ہوگا۔ ان آیات میں کمالات آنحضرت ﷺ کا بیان ہے۔ یہاں اگرچہ جبریل علیہ السلام کو معلم

قراردیں اور آنحضرت ﷺ کو متعلم، تو تنقیص شان لازم آتی ہے۔ محل مدح میں ایسا محل کلام نکالنا جس میں شائبہ ذم ہو مناسب نہیں۔ تفسیر روح البیان میں سورہ والنجم کے تحت ہے:

قَالَ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ وَجَمَاعَةٌ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى أَيْ عَلَّمَهُ اللَّهُ وَهُوَ وَصِفَ مِنَ اللَّهِ نَفْسِهِ بِكَمَالِ الْقُدْرَةِ وَالْقُوَّةِ ذُو مِرَّةٍ أَيْ ذُو أَحْكَامِ الْأُمُورِ وَالْقَضَايَاتِ وَبَيِّنَ الْمَكَانَ الَّذِي فِيهِ عَلَّمَهُ بِإِلَاسِطَةٍ۔

فرمایا حسن بصری نے اور ایک جماعت عظیمہ نے کہ تعلیم کیا حق تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو۔ شدید القویٰ فرما کر حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو کمال قدرت و قوت سے موصوف فرمایا۔ ذومرۃ سے مراد ذوا احکام الامور والقضایات ہے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ حق تعالیٰ نے اس مقام تعلیم کو بھی بیان کر دیا جہاں فرشتہ کے واسطہ کے بغیر تعلیم فرمائی۔

رسول کریم کی یہ خصوصیت کہ آپ کی ہر ہر بات وحی الہی ہے، چاہتی ہے کہ کوئی مخلوق آپ کی معلم نہ ہو، بلکہ ساری مخلوقات کو آپ فیض وجود اور کمال علم پہنچانے والے ہوں۔ اور یہ امر اس بات کا متقاضی ہے کہ علمہ شدید القوی کا وہی معنی لیا جائے جو محققین نے فرمایا ہے یعنی آنحضرت ﷺ کو سارے علوم اس نے سکھائے جو قدرت اور کمال قوت میں سب سے برتر و اعلیٰ ہے اور اس کا شاگرد کسی سکھانے والے کا محتاج نہیں بلکہ سب اسی کے محتاج ہوں۔ وہ اوّل پرتو کمال ہو اور سارا عالم اس کا پرتو۔

جنہوں نے شدید القوی سے حضرت جبریل کی ذات گرامی مراد لی ہے، ممکن ہے ان کے نزدیک حضرت جبریل کی طرف تعلیم کی اسناد حقیقی نہ ہو بلکہ مجازی ہو۔ چونکہ سیدنا جبریل حامل وحی ہیں، بارگاہ خداوندی سے بارگاہ رسالت تک ارشادات الہیہ کے پہنچانے کا وہ ایک مقدس ذریعہ رہے، لہذا انہیں مجازاً معلم کہہ دیا گیا۔ ورنہ درحقیقت معلم وہ ہے، جس نے اپنے کلام کے معنی و مفہام اور اسرار و رموز کو بلا واسطہ اپنے رسول کو سکھایا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کلام پہنچانا اور ہے اور کلام کو سمجھانا اور۔ پہنچانے والا حقیقت میں معلم نہیں ہوتا، بلکہ سمجھانے والا معلم ہوتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۖ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ﴿۱۱۳﴾

اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور سکھادیا وہ تم کو جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس آیت میں صراحۃً کتاب و حکمت کی تعلیم کی اسناد اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اسناد حقیقی ہے۔ اور جب رسول کریم کو کتاب و حکم سکھانے والا خدا ہی ہے تو پھر حضرت جبرئیل کتاب کے پہنچانے والے ہی قرار پائیں گے۔

۲۳۔۔۔ قَالَ يَا مُحَمَّدُ: سَيَدَا جِبْرِئِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالْإِتِّفَاقِ أَخْضَرْتُ ﷺ سَ مِنْ مَفْضُولِ هِيں اور آنحضرت ﷺ آپ سے افضل۔ اور ایک مفضول کیلئے مناسب نہیں کہ وہ افضل کا نام لے کر خطاب کرے۔ سرکار رسالت کا نام لیکر پکارنے کی ممانعت تو قرآن کریم سے بھی ثابت ہے۔ ارشادِ باری ہے:

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ط ﴿مورۃ النور: ۶۳﴾  
رسول کو اس طرح نہ پکارو، جس طرح تمہارا بعض بعض کو پکارتا ہے

۔۔۔۔۔ ابو نعیم حضرت عبداللہ ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں راوی ہیں:

قَالَ كَانَُوا يَقُولُونَ يَا مُحَمَّدُ يَا أَبَا الْقَاسِمِ فَتَنَاهُمُ اللَّهُ عَنْ ذَلِكَ أَعْظَمُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا يَا نَبِيَّ اللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ (تَجَلَّى الْيَقِينِ)

فرمایا (اولاً) صحابہ کرام سرکار کا نام لے کر یا کنیت سے پکارا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح ندا کرنے سے روک دیا اپنے نبی کی عظمت کو ظاہر فرمانے کیلئے۔ تو لوگ یا نبی اللہ یا رسول اللہ کہہ کر ندا دینے لگے۔

۔۔۔۔۔ امام حسن بصری اور امام سعید ابن جبیر نے اس آیت کریمہ کی یہ تفسیر فرمائی:

لَا تَقُولُوا يَا مُحَمَّدُ وَلَكِنْ قُولُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ يَا نَبِيَّ اللَّهِ (بعض) یعنی یا محمد نہ کہو، ہاں یا رسول اللہ یا نبی اللہ کہہ کر ندا کرو۔

۔۔۔۔۔ علامہ صاوی نے اسی آیت کے تحت فرمایا:

وَاسْتَفِيدَ مِنَ الْآيَةِ أَنَّهُ لَا يَجُوزُ نَدَاهُ النَّبِيَّ

بِغَيْرِ مَا يَفِيدُ التَّعْظِيمَ لَا فِي حَيَاتِهِ

یعنی۔۔۔۔۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کو ایسے الفاظ کے ساتھ ندا جاز نہیں

جس سے تعظیم نہ مفہوم ہوتی ہو۔ نہ دنیاوی حیات میں نہ وصال کے بعد۔

۔۔۔۔۔ الخضر۔۔۔۔۔ ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد ہر ایک کے گوشہ خیال سے یہ سوال بہر حال

سر اُبھارے گا کہ سیدنا جبرئیل نے نام لے کر کیوں خطاب کیا؟ اسکے مختلف جواب دئے گئے ہیں۔

(۱)۔۔۔ آیت میں نبی کریم کا نام لے کر پکارنے کی ممانعت و حرمت، امت کے ساتھ مخصوص ہے۔ حضرت جبرئیل اس سے متشکی ہیں۔ اسلئے کہ آیت کریمہ میں خطاب آدمیوں سے ہے نہ کہ ملائکہ سے۔ اس جواب کی کمزوری میرے خیال میں بالکل ظاہر ہے اسلئے کہ یہ بات درست تھی، کہ آیت کریمہ کے مخاطب آدمی تھے، مگر سوچنے کی چیز تو یہ ہے کہ آخر آدمیوں کیلئے نام پاک لیکر ندا کو ممنوع و حرام کیوں قرار دیا؟

اس کی علت یہی تو ہے کہ۔۔۔ اَعْظَمَماً لِنَبِيٍّ۔۔۔ اور جب نبی کی عظمت کا اظہار اور بارگاہ رسالت کا ادب مقصود و مطلوب ہے، تو پھر اس ضابطہء ادب سے ملائکہ کو مستثنیٰ قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ بارگاہ رسالت صرف انسانوں کیلئے ہی جائے ادب نہیں ہے بلکہ ملائکہ بھی اب اس بارگاہ کے قوانین آداب کے پابند ہیں۔ نام لے کر پکارنا اگر انسانوں کیلئے بے ادبی ہے تو پھر ملائکہ کیلئے اسکو بے ادبی کے خانہ سے کیسے نکالا جاسکتا ہے۔

۔۔۔ الختصر۔۔۔ آیت کریمہ کے دائرہ خطاب سے ملائکہ کو نکال دینے کے باوجود 'دائرہ آداب رسالت' سے انھیں باہر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ ادب گاہ ہے جہاں عرش کی بلندیاں بھی سرنگوں نظر آتی ہیں۔

ادب گما ہیست زیر آسمان از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و یازید این جا

یہ ٹھیک ہے کہ جب تک زبان وحی نے بارگاہ رسالت کے آداب میں سے اس خاص 'ادب زیر بحث' کا اضافہ نہیں کیا تھا، اس وقت تک صحابہ کرام سرکار کا نام لے کر پکارتے رہے اسلئے کہ اس وقت تک ان کے نزدیک نام لیکر پکارنا کچھ معیوب نہ تھا اور وہ اس طرح پکارنے کو خلاف ادب نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صحاح میں صحابہ کرام کے نبی کا نام لیکر پکارنے کی کافی مثالیں ملتی ہیں۔ اب ان نداؤں کو قبل تحریم کی یادگاری حیثیت حاصل ہوگئی۔ لیکن جب آیت کریمہ نے 'باب آداب میں نبی کا نام لے کر نہ پکارنے کو ادب کا روپ دیکر داخل کر دیا ہے تو پھر اس کو صرف آدمیوں کیلئے ادب قرار دینا اور ملائکہ کیلئے ادب نہ سمجھنا عقلاً مستبعد ہے۔

(۲)۔۔۔ دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ نام لے کر اسلئے خطاب کیا تا کہ حاضرین ان



کو کسی گوشے اور کسی قرینہ سے پہچان نہ سکیں۔۔۔۔۔ الحاصل۔۔۔۔۔ اپنے کو غایت درجہ پوشیدہ رکھنا مقصود تھا۔ اس خاص مصلحت کیلئے نام لے کر بلایا تا کہ لوگ سمجھیں کہ یہ کوئی اکھڑ اور اجڑ عربی ہے۔۔۔۔۔ لَ اَنۡتَ جَعَلُوۡا دُعَاۃَ الرَّسُوْلِ ۔۔۔۔۔ الخ کے نزول کے بعد صحابہ کرام جب کسی کو حضور کا نام پکارتا ہوا دیکھتے تو اس کو اکھڑ اور اجڑ ہی تصور کرتے۔

(۳)۔۔۔۔۔ تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیث اور اس سے متعلق پورا واقعہ ممکن ہے کہ اس آیت کے نزول کے پہلے کا ہو، جس میں حضور کو نام لیکر پکارنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہ جواب اس روایت سے میل کھاتا ہوا نظر نہیں آتا جس کا ذکر فائدہ نمبر ۶ کے تحت ہو چکا ہے۔۔۔۔۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ واقعہ حضور کی عمر شریف کے آخری ایام میں پیش آیا، جبکہ جملہ احکام کا نزول ہو چکا تھا۔ ایک قول کے مطابق جتہ الوداع سے کچھ پہلے۔۔۔۔۔ اھ میں واقعہ پیش آیا۔۔۔۔۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔۔۔۔۔ (۴)۔۔۔۔۔ میرے خیال میں اس کا ایک مناسب ترین جواب یہ ہے کہ ’لفظ محمد‘ جس طرح حضور کا اسم ذات ہے اسی طرح آپ کا اسم صفت بھی ہے۔ محمد کا معنی ہے:

اَلَّذِیْ یُّحَمِّدُ حَمْدًا بَعْدَ حَمْدٍ

محمد وہ ہے جس کی مسلسل تعریف و توصیف کی جائے

۔۔۔۔۔ اور بیشک یہ شان ہے حضور آیت رحمت کی کہ عالم ملکوت سے آپ پر مسلسل درود و سلام کا نذرانہ پیش کیا جا رہا ہے، جیسا کہ آیت صلوٰۃ سے ظاہر ہے۔ اس مقام پر یا محمد سے مراد یہ ہے کہ:

یَا اَیُّهَا الَّذِیْ یُّحَمِّدُ حَمْدًا بَعْدَ حَمْدٍ

۔۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔۔ اے وہ مقدس ذات جس کی مسلسل بے شمار تعریف کی جاتی ہے

یہ خوب ذہن نشین رہے کہ سیدنا جبرئیل صاحب عصمت و طہارت ہیں۔ جن میں نفس کا شائبہ تک نہیں۔ لہذا ان کے خطاب و کلام کے مناسب و پاکیزہ رخ کا انتساب ان کی ذات کی طرف متعین ہو جاتا ہے۔ اسی لئے کسی اور کو یہ اجازت ہرگز نہیں مل سکتی کہ وہ بھی مذکورہ بالا تاویل کا سہارا لیکر سرکار کا نام لیکر خطاب کرے۔ اسلئے کہ غیر معصوم کے خطاب میں نامناسب رخ کو مراد لینے میں عصمت مانع نہیں اور اہل سعادت کے نزدیک بارگاہ رسالت میں کسی خطاب کے نامناسب پہلو کا امکان بھی روح سعادت کے منافی ہے۔

ہاں اگر کوئی ایسا نیک نفس ہو، جس کی عدالت و سعادت اور خلوص و للہیت غیر مشکوک بلکہ منصوص ہو، وہ اگر بالفرض کسی حکمت بالغہ کے تحت، اس طرح کے خطاب و کلام کو اپناتے ہوئے نہیں نظر آئے تو وہ ضرور اس بات کا مستحق ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس کے خطاب و کلام کی حکمت تک ذہن و فکر کو پہنچایا جائے اور اس کی ایسی بے غبار تاویل کی جائے جو اس کی شان کے مناسب ہو۔

(۵)۔۔۔۔۔ مسند امام اعظم میں ہے کہ حضرت جبرئیل نے یا رسول اللہ کہہ کر خطاب فرمایا تھا جیسا کہ فائدہ نمبر ۱۸ کے تحت بیان کر چکا ہوں ایسی صورت میں اس بات کا امکان نکلتا ہے کہ جن روایتوں میں یا محمد کہہ کر اپنی عرض پیش کرنے کا ذکر ہو وہ سلسلہ رواۃ میں سے کسی راوی کے سہو پر مبنی ہو۔۔۔۔۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

۲۳۔۔۔۔۔ سیدنا جبرئیل جب بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو اذلاً آپ پر سلام عرض کیا، سرکار نے اس کا جواب عطا فرمایا، جیسا کہ فائدہ نمبر ۱۸ کے تحت مسند امام اعظم کی روایت میں گزر چکا ہے۔ اب جن روایتوں میں اس کا ذکر نہیں تو اس کی صحیح وجہ یہ ہے کہ راوی نے اسے نقل نہیں کیا اور ظاہر ہے جس نے کسی بات کو یاد رکھا، اس کا قول حجت ہے اس پر جو یاد نہ رکھ سکا۔ یا جس نے کسی بات کا ذکر کیا اس کی روایت مقدم ہے، اس کی روایت پر جس نے اس کے ذکر کرنے سے خاموشی اختیار کر لی۔ اس لئے کہ حافظ وذاکر کی روایت سے واقعات کے دوسرے گوشے علم کی روشنی میں آجاتے ہیں۔

مسند امام اعظم میں السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ ہے۔ لیکن بعض روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت جبرئیل نے عرض کیا السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدٌ۔ ان دونوں روایتوں میں توافق کی یہ صورت نکالی گئی ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت جبرئیل نے دونوں کو ملا کر ایک ساتھ یوں عرض کیا ہو۔۔۔۔۔ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ۔۔۔۔۔ ایک راوی نے ایک کلمے کی روایت پر اکتفا کیا اور دوسرے نے دوسرے کلمے پر۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یا محمد والی روایت راوی کے سہو پر مبنی ہو۔۔۔۔۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

۲۵۔۔۔۔۔ علامہ قرطبی نے السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا مُحَمَّدٌ کی روایت کی نشاندہی کی ہے۔ اس قول کی بنیاد پر حضرت جبرئیل نے نبی کریم سے السَّلَامُ عَلَيْكَ کے بجائے السَّلَامُ عَلَيْكُمْ

عرض کیا۔ اگر واقعی ایسا ہوا ہے تو یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ضمیر واحد کی جگہ ضمیر جمع کا استعمال سرکار نبوت کی تعظیم و توقیر کے قصد و ارادہ سے ہے۔

۲۶۔۔۔۔۔ اخبرنی (یعنی مجھے بتادیجئے) یہاں امر استدعا کیلئے ہے، اسلئے کہ یہ حقیقت اپنے مقام پر دلیل و برہان کی روشنی میں آچکی ہے کہ انبیائے کرامؑ ملائکہ علویہ سے افضل و اعلیٰ ہیں۔

۲۷۔۔۔۔۔ عَنِ الْإِسْلَام: اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ حضور نبی کریم حضرت جبرئیل کو اسلام کا لغوی معنی سمجھائیں، بلکہ سوال کا مقصد یہ تھا کہ سرکار رسالت اسلام کا شرعی معنی واضح فرمادیں۔

چنانچہ سر کاہدینہ نے اسلام کے ارکانِ خمسہ کو شمار کرادیا۔ اسلام چونکہ ایمان کی علامت  
 --- نیز۔۔۔ ایمان و تصدیق پر دلیل و حجت ہے، لہذا اسکا ذکر پہلے کیا گیا، تاکہ شریعت کو سمجھانے  
 میں آسانی ہو۔ اور پھر تدریجاً اونی سے اعلیٰ کی طرف رخ کیا گیا اور ایمان کو سمجھایا گیا۔ پھر اور آگے  
 بڑھ کے اخلاص و یقظہ و دیگر احسان کے چہرے سے نقاب کشائی کی گئی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اپنے مقام و  
 مرتبہ کے لحاظ سے اسلام سے افضل ایمان ہے اور ایمان سے افضل احسان ہے۔ اسلام کا تعلق قالب  
 سے ہے اور ایمان کا تعلق قلب سے ہے۔ قالب ظاہر ہے اور قلب باطن، تو پہلے اسکے متعلق سوال کیا  
 گیا جو قالب سے متعلق ہے پھر اسکے متعلق توضیح طلب کی گئی جو قلب سے متعلق ہے۔

صحیح مسلم، کتاب الحمیدی، جامع الاصول، ریاض الصالحین اور شرح السنہ میں اسلام سے متعلق سوال و جواب مقدم ہے، ایمان سے متعلق سوال و جواب پر۔ مگر علامہ بغوی نے مصابیح میں جس روایت کو لیا ہے، اس میں پہلے ایمان کا ذکر ہے پھر اسلام کا، اور یہ شاید اسلئے کہ ایمان اصل ہے اور اسلام اس کی فرع۔ تو پہلے جڑ اور بنیاد کو سمجھنا مناسب خیال کیا گیا۔ پھر فرع اور پھول پتی کو سمجھایا گیا۔

لیکن صاحب مشکوٰۃ کو وہی روایت مناسب حال معلوم ہوئی، جس میں پہلے اسلام کا ذکر ہے، لہذا انھوں نے اس کو اپنایا۔ بخاری میں بھی ذکر اسلام پر ذکر ایمان کو مقدم کیا گیا ہے مگر اس کے راوی حضرت عمر نہیں ہیں بلکہ حضرت ابو ہریرہ ہیں۔

ایک روایت میں احسان کا ذکر آخر میں نہیں ہے بلکہ اسلام و ایمان کے درمیان ہے۔

ایک قول کے مطابق اس میں اشارہ یہ ہے کہ احسان کا کل چونکہ قلب ہے، لہذا اسکے ذکر کو اسلام و ایمان کے ذکر کے قلب میں رکھا گیا ہے۔

اور ایک دوسرے قول کے مطابق چونکہ احسان و اخلاص کا تعلق اسلام اور ایمان دونوں سے ہے۔ لہذا اس کو ان دونوں کے بیچ میں رکھا گیا ہے۔ مگر اس سلسلے میں محققین کی بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ تقدیم و تاخیر راویوں کی طرف سے ہے۔ اسلئے کہ قضیہ ایک ہی ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں جو کچھ بھی واقع ہے وہ ایک ہی چیز ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ بھی ہو اور وہ بھی ہو۔ ہاں راویوں نے اس کی تعبیر میں مختلف اسلوب بیان سے کام لیا ہے۔

۲۸۔۔۔۔ اسلام سے متعلق سوال کے جواب کا حاصل بلفظ مختصر یہ ہوا کہ 'اسلام' یہ ہے کہ بندہ دل کی نیاز مند یوں کے ساتھ اپنے کو بالکل اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمان بردار بنادے۔ سارے ارکان اسلام یعنی شہادت کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ وغیرہ اسی کے مظاہر ہیں۔

۲۹۔۔۔۔ قَالَ الْإِسْلَامُ: حضرت جبریل کے اس سوال پر کہ آپ ارشاد فرمائیں کہ اسلام کی حقیقت شرعی کیا ہے؟ تو اس کے جواب میں لفظ اسلام کے اعادہ کی ضرورت نہ تھی بلکہ صرف ضمیر سے کام لیکر یہ کہا جاسکتا تھا کہ۔۔۔۔۔ وہ یہ ہے کہ تو شہادت دے۔۔۔۔۔ اے

مگر سرکار نے یہ جواب عطا فرمایا کہ 'اسلام' یہ ہے کہ تو شہادت دے۔۔۔۔۔ اے، محض اسلئے تاکہ بات اظہر من الشمس رہے۔ اس سے ہر سمجھانے والے کو یہ درس ملتا ہے کہ جب وہ کسی کو کوئی بات سمجھائے تو جہاں تک ہو سکے بیان کو واضح تر بنا کر پیش کرے۔

۳۰۔۔۔۔ اَنْ تَشْهَدَ: (یہ کہ تو شہادت دے) اے مخاطب! خطاب عام ہے اس جواب کے ہر مخاطب کیلئے یعنی اس وقت جو مخاطب ہے اس کیلئے بھی اسلام کی یہی تشریح ہے اور جو آئندہ اس جواب کا مخاطب ہوگا۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ ہو سکے گا اس کیلئے بھی یہی تشریح ہے، جواب دینے والا کوئی بھی ہو۔

۳۱۔۔۔۔ چونکہ مطلق علم سے شہادت، انکشاف میں مبلغ تر ہے اسلئے 'تَشْهَدَ' کا لفظ اختیار فرمایا گیا۔ اور 'تَعْلَم' نہیں کیا گیا۔ اسلئے 'اَدَا' شہادت میں 'اَشْهَدَ' کی جگہ لفظ 'اَعْلَمَ' کو کافی نہیں قرار دیا گیا۔

۳۲۔۔۔ اَنْ لَّا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ ليعنى لَا اِلَهَ مَعْبُودٌ بِالْحَقِّ فِي الْوُجُودِ اِلَّا اللّٰهُ: اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ اللہ اسی معبود برحق کا اسم ذات ہے جو جمع صفات کمالیہ سے متصف ہے۔۔۔ الخضر۔۔۔ لفظ اللہ کا مصداق ایک ایسی ذات ہے جو تمام صفات کمالیہ کی جامع اور تمام عیوب و نقائص اور شوائب امکان سے پاک و منزہ ہے۔

اسلئے ایک قول کے مطابق لفظ اللہ کی جگہ لفظ الرحمن رکھ دینے سے اور الا اللہ کے بجائے 'الا الرحمن' کہہ دینے سے توحید مطلق صحیح نہیں ہوتی۔

۳۳۔۔۔ از روئے لغت 'توحید' ایک بنانے کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی شے کی وحدانیت (اکیلا ہونے کی حالت) کا علم رکھتے ہوئے اس یکتائی کا حکم دینا۔

علامہ سید شریف جرجانی نے 'التعريفات' میں توحید لغوی کی ان لفظوں میں تشریح کی ہے۔۔۔ اَلتَّوْحِيدُ فِي اللَّغَةِ الْحُكْمُ بِأَنَّ الشَّيْءَ وَاحِدٌ وَالْعِلْمُ بِأَنَّهُ وَاحِدٌ۔۔۔ اس کا بھی حاصل وہی ہے جو میں عرض کر چکا ہوں یعنی کسی شے کے واحد ہونے کا حکم دینا اور اس کے واحد ہونے کو جاننا، توحید لغوی ہے۔

اعتقاد و قول و عمل سے یقین و عرفان کی لازوال و دوامی توانائیوں کے ساتھ ذات و صفات الہی کیلئے ایسی یکتائی ثابت کرنا جو اپنے اندر کسی کی کسی طرح کی شرکت و مشابہت کی گنجائش نہ رکھتی ہو۔ بلکہ ہر طرح کی شرکت و مشابہت سے منزہ و پاک ہو۔ یہ ہے اہل شریعت کی اصطلاح میں توحید کا حاصل و خلاصہ۔ مذکورہ بالا اس گل کو، تین خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔۔۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت۔

۲۔۔۔ اس کی وحدانیت و یکتائی کا اقرار و اعتراف۔

۳۔۔۔ اس کے تمام انداز و امثال کی بالکلیہ نفی۔

۱۔۔۔ اہل حقیقت کی اصطلاح میں ذات الہیہ کو افہام کے جملہ تصورات اور اوہام و اذہان کے جملہ تخیلات سے وراء الوراہ سمجھنا توحید ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توحید کے کچھ ظاہری احوال ہیں اور کچھ باطنی۔ یعنی اس کیلئے کچھ پھلکے ہیں اور کچھ مغز، بادام کی طرح۔



توحید کا سب سے اوپری چھلکا محض زبان سے اقرار کرنا ہے اور اس کے نیچے کا دوسرا پہلکا یقین و اذعان کے ساتھ دل سے اعتقاد کرنا ہے۔ رہ گیا اس کا مغز تو اس کا پہلا مغز یہ ہے کہ وحد پر اللہ کے نور سے راز تو حید منکشف ہو جائے اور وہ اشیائے کثیر کو فاعل واحد سے صادر ہوتا دیکھنے لگے۔ اور اس کے مغز کے اندر کا مغز یعنی لب لباب یہ ہے کہ موجد عالم وجود میں اس ایک کے سوا کسی کو نہ دیکھے۔ اور اپنے کو اس واحد حق کے جمال میں ایسا غرق کر دے کہ اس کے غیر کی طرف ملتفت ہی نہ ہو۔

۳۴۔۔۔ جلالہ العلم حضرت مولانا سید غلام جیلانی صاحب قبلہ دامت برکاتہم العالیہ نے غلاف اشرفی سے اخذ کرتے ہوئے اپنی بلند پایہ تصنیف ’بشیر القاری شرح صحیح البخاری‘ میں توحید سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ پیش کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں:

توحید کے تین مرتبے ہیں، ایک کا نام ’توحید ایمانی‘ ہے اور وہ یہ ہے کہ بندہ صرف اللہ تعالیٰ کیلئے الوہیت اور استحقاق عبادت کی دل سے تصدیق اور زبان سے اس کا اقرار کرے۔ یہ توحید علم ظاہر سے مستفاد ہوتی ہے۔ اس کا حصول شرک جلی سے بچا کر انسان کو مسلک اسلام میں منسلک کر دیتا ہے۔ صوفیائے کرام، عامہ مومنین کے ساتھ اس مرتبہ توحید میں شریک ہوتے ہیں اور دیگر مراتب کی رو سے انکو امتیاز حاصل ہوتا ہے۔

دوسرے کا نام ’توحید علمی‘ ہے: وہ یہ ہے کہ بندہ جب طریق تصوف پر گامزن ہو تو اوّل اس بات کا یقین کامل حاصل کرے کہ موجد حقیقی اور مؤثر مطلق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اس پر بھی یقین رکھے کہ جملہ ذوات و صفات و افعال اسکی ذات و صفات اور افعال میں منطوی ہیں۔ ہر ذات کے فروغ کو ذات مطلق کے نور سے ناشی اور ہر صفت کو صفت مطلق کا پر تو اعتقاد کرے۔ چنانچہ جہاں کہیں علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر کا ظہور ہو تو یہی یقین کرے کہ الہی علم، الہی قدرت، الہی ارادہ، الہی سمع، الہی بصر کے یہ سب آثار ہیں۔ اسی طرح باقی صفات کو الہی صفات کے آثار اعتقاد کرے۔

حق سبحانہ تعالیٰ کے دست تصرف میں اپنے آپ کو ایسا سمجھے جیسے ’قلم بدست کاتب‘ و سائنک و معدور جان کر ان سب کو نظر انداز کر دے۔ اگر کوئی چیز موافق طبع پیش آئے،

شکر بجالائے اور یہ سمجھے کہ حق سبحانہ اس صورت میں ظاہر ہو کر تعلق فرماتا ہے اور اگر کوئی ناپسندیدہ چیز پہنچے تو یقین کرے کہ حق تعالیٰ اس صورت میں متجلی ہو کر عقوبت فرماتا ہے تاکہ ناپسندیدہ اطوار سے اجتناب کر کے پسندیدہ طریقے پر آجائے۔

تیسرے کا نام ہے 'توحید حالی': وہ یہ ہے کہ حال توحید ذات موحّد کیلئے وصف لازم ہو جائے اور بجز قدرے قلیل رسوم و جود کی جملہ تاریکیاں نور توحید کے اشراق میں گم ہو جائیں۔ توحید حالی کے نور کو اس درجہ فروغ ہو کہ توحید علمی کا نور اس میں پوشیدہ ہو جائے، جیسے آفتاب کے نور میں ستاروں کا نور چھپ جاتا ہے۔ اس مرتبہ میں پہنچ کر وجود واحد کے مشاہدہ جمال میں وجود موحّد اس قدر مستغرق ہو، تاکہ واحد کی ذات و صفات کے سوا کوئی چیز اس کی نظر میں نہیں آتی، یہاں تک کہ یہ توحید بھی اپنی صفت معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کو بھی صفت واحد جانتا ہے اور اس جاننے کو بھی اسی کی صفت سمجھتا ہے۔ موحّد کی ہستی اس طریقے سے بحر توحید کی تلاطم خیز امواج میں بڑ کر قطرہ کی طرح ناپید ہو جاتی ہے۔

شرک خفی سے کلمۂ احترام اس مرتبہ میں حاصل ہوتا ہے اور آدمی کے واسطے اس سے بالاتر توحید کا مرتبہ نہیں۔ توحید علمی اور توحید حالی کے درمیان امتیاز کی دو وجہ اور بھی ہیں: اول۔۔۔ بلحاظ انجام: وہ یہ کہ توحید علمی میں نتیجتاً بعض رسوم بشریت فنا ہو جاتی ہیں اور اکثر باقی رہتی ہیں اور توحید حالی میں اکثر فنا ہو جاتی ہیں اور بعض باقی رہتی ہیں اور وہ بھی قدرے قلیل تاکہ موحّد سے ترتیب افعال اور تہذیب اقوال باقی رہے۔

دوم۔۔۔ بلحاظ آغاز: اور وہ یہ کہ توحید علمی کا منشاء نور مراقبہ ہے اور توحید حالی کا منشاء نور مشاہدہ۔ بروقت مشاہدہ الہی موحّد کو ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز لذت حاصل ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے جسم موحّد پر آلام شدیدہ کا ورود اصلاً اثر انداز نہیں ہوتا، بلکہ اس عالم کیف میں موحّد پر اگر پہاڑ گر پڑے تو وہ بھی محسوس نہ ہوگا۔ ہاں اس لذت شہود کے اختتام پر آلام محسوس ہونے لگتے ہیں جیسے کہ اس سے پیشتر محسوس ہوتے تھے۔

۳۵۔۔۔ توحید ایمانی کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ ایک توحید نظری، اور دوسری توحید

تقلیدی۔ توحید نظری یہ ہے جس میں اللہ کی الہیت اور اس کی الوہیت پر یقین دلیل و برہان کے ذریعہ بھی حاصل کیا جائے۔ یعنی صرف خبر صادق کی تصدیق ہی ذریعہ علم نہ قرار پائے، بلکہ قوت فطریہ اس کو منوانے میں دخل ہو۔

رہ گئی توحید تقلیدی تو اس کا معاملہ توحید نظری کے برعکس ہے۔ اسلئے کہ اس میں موجد کے یقین و اعتقاد کی شاندار عمارت کی بنیاد خبر صادق کا ارشاد اور اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ خبر صادق کے ارشاد و تصدیق کے بعد موجد مقلد اپنے دل کو شکوک و شبہات اور حیرانی و سرشتگی سے بالکلیہ پاک و صاف کر لیتا ہے۔ توحید حالی کے اوپر بھی توحید کی ایک اور قسم کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جس کو توحید کی چوتھی قسم قرار دیا گیا ہے۔

اور اس چوتھی قسم کا نام توحید الہی ہے۔ اس مقام کے موجد کا یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ ازل میں اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں واحد اور صفات میں احد تھا اور صرف وہی تھا، اسکے ساتھ کچھ نہ تھا اور آج بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ تھا، یعنی ذات میں واحد صفات میں احد اور وجود میں لاشریک، یعنی اس کے سوا نہ کوئی موجود تھا اور نہ آج موجود ہے۔

ارشادِ بانی۔۔۔ کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ۔۔۔ سے اسی طرف اشارہ ہے۔ اسلئے کہ ہالک فرمایا بھلک نہ فرمایا۔ ہالک کی صورت میں ارشاد کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا سب صاحب فنا ہیں، یعنی عالم فنا میں ہیں۔ اور اگر بھلک فرمایا جاتا تو معنی یہ قرار پاتا کہ اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہو جائے گی۔

اس صورت میں ارشاد کی روشنی میں غیر اللہ کے مستقل وجود کو ماننا پڑے گا۔۔۔۔۔ انصاف۔۔۔۔۔ ان موحدین کے نزدیک ارشاد مذکور میں بھلک کے بجائے ہالک فرمانے سے اشارہ ہوتا ہے کہ اللہ کی عزت و وحدانیت اور غیرت احدیت نے غیر اللہ کو صفت و جود سے متصف نہیں کہا ہے۔ شاید ان کا مقصد یہ ہوا کہ ’وجود حقیقی‘ ایک ہے، بقیہ سارے وجود غیر حقیقی اور اسی وجود حقیقی کے عکس و ظلال ہیں۔۔۔۔۔ بلاشبہ۔۔۔۔۔ آفتاب روشن ہے مگر جن جن آئینوں اور ذروں پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے ان کو بھی روشن کہا جاتا ہے۔

حالانکہ فی نفسہ نہ کوئی آئینہ روشن ہے اور نہ کوئی ذرہ۔۔۔۔۔ الحاصل۔۔۔۔۔ فی نفسہ روشن

آفتاب ہی ہے۔ یونہی جس پر اللہ نے اپنے وجود کی تجلی ڈال دی اسے موجود کہہ دیا گیا۔ حالانکہ فی حد ذاتہ اور فی نفسہ وہ موجود نہیں، بلکہ خدا ہی موجود ہے۔

۳۶۔۔۔ توحید کی تعریف و حقیقت سے متعلق بحر العلوم، علامہ مفتی عبدالحفیظ صاحب قبلہ علیہ الرحمہ کی یہ تحریر توحید کی حقیقت شرعی سمجھانے کیلئے بہت واضح ہے۔ فرماتے ہیں:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ یہ کلمہ کلمہ توحید ہے، اس میں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ یہی توحید ہے۔ غور فرمائیے لا حرف نفی ہے الہ اس کا اسم ہے ال احرف استثناء ہے، اللہ حرف نفی کا خبر ہے۔ ترجمہ یہ ہوا: نہیں ہے کوئی الہ اللہ تعالیٰ کے سوا۔

اس کلمہ میں دو اسم ہیں۔ اللہ اور اللہ دو حرف ہیں لا اور الہ۔ ان دونوں اسموں اور حروف کی تعریف معلوم ہو جائے تو توحید کی حقیقت بھی واضح ہو جائے۔

اللہ اس ذات واجب الوجود کا نام ہے جو تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے۔ عقائد اہلسنت وجماعت کی معتبر کتاب 'مسامرہ' مصنفہ علامہ کمال ابن ابی شریف رحمہ اللہ علیہ کے صفحہ ۲۱ میں ہے: وَكَلِمَةُ الْجَلَالَةِ اسْمٌ لِلذَّاتِ الْوَاجِبِ الَّتِي لَا تُجُودُ إِلَّا مُسْتَجْمَعَةً لِجَمِيعِ صِفَاتِ الْكَمَالِ کلمہ جلالت، اللہ سے دو باتیں معلوم ہونگی:

(۱) خدا کی ذات واجب الوجود ہے۔

(۲) وہ تمام صفات کمالیہ سے مستصف ہے۔

اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے۔ یعنی اس کا وجود اس کی ذات سے ہے اور اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں۔

۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ولم یولد۔

۔۔۔ علامہ سعد الدین تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ شرح عقائد میں فرماتے ہیں:

أَيُّ الدَّائِثِ وَاجِبِ الوجودِ الَّذِي يَكُونُ وجودُهُ  
مِنْ ذَاتِهِ وَلَا يُحْتَاجُ إِلَى شَيْءٍ أَصْلًا.

---'مسامرہ شریف' میں ہے:

وَالْأَوَّلُ وَهُوَ الْقَدَمَةُ بِنَفْسِهِ بِاطْلِلْ لِأَنَّهُ لِمَا ثَبَتَ أَنَّهُ الْمَوْجِدُ  
الَّذِي اسْتَنْدَتِ إِلَيْهِ كُلُّ الْمَوْجُودَاتِ ثَبَتَ عَدَمُ اسْتِنَادِهِ

إِلَى غَيْرِهِ قَلِيلٌ أَنْ يُكُونَ وَجُودُهُ لَهُ مِنْ نَفْسِهِ

اِی اقتضاستہ ذاتہ المقدسۃ افتضاء تاما

--- ملا علی قاری مکی رحمۃ اللہ علیہ شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں:

وَهَذَا لِأَنَّهُ تَعَالَى وَاجِبُ الوجودِ لِذَاتِهِ وَمَا سِوَاهُ مُمَكِّنُ الوجودِ

فِي ذَاتِهِ فَوَاجِبُ الوجودِ هُوَ الصَّمَدُ الَّذِي لَا يُفْتَقَرُ

إِلَى شَيْءٍ وَيُخْتِاجُ كُلُّ مُمَكِّنٍ إِلَيْهِ فِي الْإِيجَادِ وَأَمَدِ إِدِهِ

--- حضرت مولانا فضل رسول صاحب عثمانی بدایونی رحمۃ اللہ علیہ معتقد المستند میں فرماتے ہیں:

أَنْ وَجُودُهُ تَعَالَى وَاجِبٌ أَيْ لَا زَمَ مَحْتَمٍ عَقْلًا وَشَرْعًا بِذَاتِهِ

أَيْ أَنَّهُ وَجَدَ بِمُقْتَضَى ذَاتِهِ لَا بِعِلَّةٍ فَلَا يَقْبَلُ الْعَدَمَ أَوَّلًا وَآخِرًا

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود واجب ہے، ذاتی ہے، حقیقی ہے، غیر عطائی ہے، ہمیشہ سے ہے، اس کو ازلی کہتے ہیں اور ہمیشہ رہے گا، اسی کو ابدی کہتے ہیں۔ ممکن نہیں، حادث نہیں، عطائی نہیں، فانی نہیں۔

هُوَ الْأَوَّلُ هُوَ الْآخِرُ یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات معری عن الصفات نہیں ہے

لاحالہ وہ متصف بالصفات ہے، ابھی آپ کو بتایا گیا کہ اللہ اس کو کہتے ہیں جو واجب الوجود ہوا اور جامع صفات کمالیہ ہو۔

عقائد نسفی میں ہے وَلَهُ صِفَاتٌ أَرْبَعَةٌ قَائِمَةٌ بِذَاتِهِ اور اس کی تمام صفتیں کمال والی

ہیں ایسی کوئی صفت نہیں جو نقصان و عیب رکھتی ہو، بلکہ ایسی بھی نہیں جو کمال و نقصان سے خالی ہو۔ مسامرہ اور اس کی شرح میں ہے:

يُسْتَحِيلُ عَلَيْهِ سَمَاتُ النِّقْصِ كَالْجَهْلِ وَالْكَذِبِ بَلْ يَسْتَحِيلُ عَلَيْهِ

كُلُّ صِفَةٍ لَا كَمَالَ فِيهَا وَلَا نَقْصٌ لِأَنَّ كُلَّ أَمْرٍ صِفَاتِ الْإِلَهِ صِفَاتٌ كَمَالٌ

جب اس کی تمام صفتیں کمال والی ہیں تو کمالی صفت یہی ہے کہ وہ صفتیں واجب و قدیم ہوں۔ اس کی ذات سے قائم ہوں ممکن نہ ہوں۔ حادث نہ ہوں، فانی نہ ہوں، عطائی نہ ہوں۔

عقائد نسفی کی عبارت گزر چکی وَلَهُ صِفَاتٌ أَرْبَعَةٌ قَائِمَةٌ بِذَاتِهِ۔

--- شرح عقائد نسفی میں ہے:

وَفِي كَلَامِ بَعْضِ الْمُتَأَخِّرِينَ كَالْإِمَامِ حَمِيدِ الدِّينِ الصَّرِيدِي



ومن تبعه تصريح بان الواجب الوجود هو الله تعالى وصفاته۔

۔۔۔ شرح فقہ اکبر میں ہے:

إِنَّ صِفَاتِ اللَّهِ تَعَالَى وَأَسْمَاءُ كُلِّهَا أَرْ لِيَّةٌ  
لَا بَدَايَةَ لَهَا وَآخِرَةَ لَا نَهَايَةَ لَهَا

۔۔۔ پس صرف کلمہ، جلالت اللہ سے ثابت ہو گیا کہ اس کی ذات بھی واجب ہے اور اس کی صفات بھی واجب ہیں۔ دونوں میں سے کوئی عطائی نہیں، حادث نہیں، ایسی ذات جو واجب الوجود ہو اور تمام صفات کمالیہ سے متصف ہو اور اس کی صفتیں بھی واجب اور ذاتی ہوں ایک ہی ہو سکتی ہے نہ دو، نہ تین، نہ اس سے زیادہ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔۔۔ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ۔۔۔ فرما دیجئے کہ اللہ ایک ہے۔ اس کلمہ جلالت، اللہ، سے وجوب ذات و صفات معلوم ہوا اور اس سے توحید ذات معلوم ہوئی۔ یعنی اللہ ایک ہے۔ الہ ایک اسم ہے فعال کے وزن پر الوہ اسم مفعول کے معنی میں اس کا مصدر ہے الہیہ اور الوہیہ جس کے معنی ہیں عبادت (مراج)۔

۔۔۔ تفسیر بیضاوی میں ہے:

وَأَشْتَقَّاقُهُ مِنْ إِلَهٍ الْهَيْةُ وَالْوَهْيَةُ بِمَعْنَى عِبَادَةٍ

۔۔۔ تو الہ کے معنی ہوئے معبود یعنی اللہ معبود ہے۔ لا وَاِلَّا یہ دونوں حروف جب جمع ہو جاتے ہیں تو حصر و قصر کا فائدہ دیتے ہیں۔

تخلص المقارح میں ہے، حصر کے طریقوں میں بتایا۔۔۔ وَمِنْهَا النَّفْيُ وَالْإِسْتِنَاءُ۔۔۔ اس کلمہ، حصر سے توحید معبودیت معلوم ہوئی یعنی لا وَاِلَّا نے معبودیت کو خدا کیلئے منحصر کر دیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی معبود ہے، وہی مستحق عبادت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔۔۔ وَاللَّهُ كُ م إِلَهٌ وَاحِدٌ۔۔۔ اب کلمہ طیبہ کا ترجمہ یہ ہوا۔۔۔ نہیں ہے کوئی معبود مستحق عبادت سوا اللہ کے۔۔۔ یعنی اس ذات کے جو واجب الوجود ہے اپنی ذات و صفات دونوں اعتبار سے اور اس کی صفتیں سب کمال والی ہیں۔ یعنی ممکن نہیں، حادث نہیں، عطائی نہیں۔

## توحید اسلام:

- ۱۔۔۔ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے، ازلی ہے، ابدی ہے اور اس کی تمام صفاتیں بھی واجب، ازلی و ابدی ہیں۔ دونوں میں کوئی ممکن، حادث، عطائی نہیں۔
- ۲۔۔۔ وہ ہی حقیقی معبود ہے:

## کفر:

- ۱۔۔۔ خدا کو موجود نہ جاننا، واجب الوجود نہ ماننا، اس کی صفات کو بھی ایسا ہی نہ ماننا۔
  - ۲۔۔۔ اس کو معبود حقیقی نہ یقین کرنا۔
- دونوں باتیں مستقل کفر ہیں۔ کلمہ ’توحید‘ نے جو کچھ بتایا اس کے خلاف شرک ہے یعنی:
- ۱۔۔۔ خدا کے سوا کسی کی ذات و صفات کو واجب، ازلی، ابدی غیر عطائی جاننا بھی شرک ہے۔
  - ۲۔۔۔ اور اس کے سوا کسی کو معبود مستحق عبادت سمجھنا بھی شرک ہے۔
- ۔۔۔ علامہ تقی زانی شرح عقائد میں اور ملا علی قاری رحمہ اللہ علیہ شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں:
- الْأَشْرَاقُ هُوَ الْكِبَالُ الشَّرِيكَ فِي الْأُلُوْهِیَّةِ بِمَعْنَى وُجُوبِ الْوُجُودِ  
كَمَا لِلْمُجُوسِ أَوْ بِمَعْنَى اسْتِحْقَاقِ الْعِبَادَةِ كَمَا لِلْعَبْدَةِ الْأَصْنَامِ۔
- شرک یہ ہے کہ کسی کو الوہیت میں شریک، ثابت کیا جائے، بمعنی وجوب الوجود، جیسا مجوس کرتے ہیں یا بمعنی استحقاق عبادت، جیسا بت پرست کرتے ہیں۔
- پس! جس طرح توحید کی دو قسمیں ہوئیں:

(۱) توحید وجوب ذات و صفات

(۲) توحید معبودیت

۔۔۔ اس طرح شرک کی بھی دو قسمیں ہوئیں:

(۱) شرک فی وجوب الذات والصفات

(۲) شرک فی العبادت

کلمہ طیبہ نے اپنے منطوق کے اعتبار سے توحید بتائی اور مفہوم کے اعتبار سے شرک سمجھایا۔ پس جو خداوند تعالیٰ کو واجب الوجود جانتا ہے اسکی صفاتوں کو ذاتی، ازلی، ابدی، غیر عطائی ماننا

ہے اور اسی کو معبود سمجھتا ہے وہ معبود ہے۔ معبود ہونے کیلئے دونوں باتوں کا بیک وقت ہونا ضروری ہے۔ اور جو خداوند تعالیٰ کے سوا کسی چیز کو یا اسکی صفتوں کو واجب، ازلی، ابدی، غیر عطائی جانتا ہے، وہ مشرک ہے، جیسے مجوس۔ اور جو اسکے سوا کسی کو معبود سمجھتا ہے وہ مشرک ہے جیسے بت پرست۔

مشرک ہونے کیلئے دونوں شرکوں کا بیک وقت موجود ہونا ضروری نہیں، بلکہ دونوں چیزیں مستقل شرک ہیں۔ یعنی دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی پائی جائے گی تو مشرک ہو جائے گا:

(الف)۔۔۔ اگر کوئی خدا کے سوا کسی کو واجب، ازلی، ابدی جانتا ہے جب بھی مشرک خواہ معبود خدا ہی کو جانتا ہو۔

(ب)۔۔۔۔۔ یا کسی کی صفتوں کو ازلی، ابدی، استغالی، غیر عطائی جانتا ہو جب بھی مشرک خواہ خدای کو معبود جانتا ہو۔

(۲) خدا کے سوا کسی اور کو بھی معبود جانتا ہے تو وہ بھی مشرک خواہ اس کو واجب الوجود یا اس کی صفاتوں کو ازلی، ابدی نہ جانتا ہو۔

حضرت بحر العلوم کی مذکورہ بالا تشریحات کو سمجھ لینے والے کیلئے ان حقائق کا سمجھ لینا نہایت آسان ہے جن کی نشاندہی فاضل جلیل علامہ سید محمود احمد صاحب نے فیوض الباری میں ان لفظوں میں کی ہے کہ:

’جو لوگ اللہ کے عطا کئے ہوئے کمالات اس کے بندوں میں مانتے ہیں

اور کمالات کو عطاء الہی جانتے ہیں وہ ہرگز مشرک نہیں۔

مثلاً۔۔۔ کوئی شخص آدمی کو سمیع اور بصیر کہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے

اس کو صفت سمع و بصر عطا فرمائی ہے، تو وہ مومن اور موحد ہے، مشرک نہیں۔ مشرک جب ہوتا جب کہ یہ مانتا کہ آدمی میں سمع و بصر کی صفت ذاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اللہ عزوجل کی صفات میں سمیع و بصیر ذکر کیا ہے مگر اس کے باوجود انسان کو بھی سمیع و بصیر قرار دیا ہے۔

فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٢﴾ (سورة المدثر: ٢)

پس ہم نے انسان کو سمیع و بصیر بنایا

۔۔۔ اور یہ شرک اس لئے نہیں کہ انسان میں جو سمیع و بصر ثابت کی گئی ہے، وہ عطائی ہے اور خدا میں ذاتی ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں کتاب و سنت سے دی جاسکتی ہیں، جن کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ کسی بھی کمال کو جو ممکن البشر ہے، غیر اللہ میں عطائی مانا جائے تو شرک نہیں اور ذاتی مانا جائے تو شرک ہے۔ اگر ذاتی و عطائی کا فرق نہ کیا جائے تو پھر تو انسان ہر بات میں مشرک ہو جائے۔

۔۔۔۔۔ مثلاً۔۔۔۔۔ یہ کہے کہ میں سنتا ہوں، میں دیکھتا ہوں، میں موجود ہوں، خدا نے قوت دی، پانی نے پیاس بجھائی، آگ نے جلادیا، سردی نے نقصان پہنچایا، دوائے فائدہ دیا، یہ سب باتیں شرک ہو جائیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ میں دیکھتا ہوں تو اس عقیدے کے ساتھ کہتا ہے کہ دیکھنے کی قوت مجھ میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے، خود بخود نہیں ہے۔ جب ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ دوائے شفا دی تو اس عقیدے کے ساتھ کہتا ہے کہ دوائے شفا دینے کی طاقت اور تاثیر اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ اگر خدا نہ چاہے تو نہ میں دیکھ سکوں اور نہ دوائے شفا دھاسکے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کمال کو غیر اللہ میں اگر ذاتی مانا جائے تو وہ شرک ہے۔ اور اگر عطائی طور پر مانا جائے تو ہرگز شرک نہیں ہے۔

جو شخص عطائی کمال کو غیر اللہ میں ماننے کو شرک کہتا ہے وہ جاہل ہے اور اگر جان بوجھ کر کہتا ہے تو خود کافر ہے۔ کیونکہ اس نے عطائی کمال ماننے والے کو شرک کہہ کر یہ ظاہر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے کمالات و صفات عطائی ہیں۔ اور وہ مستغنی اور بے نیاز نہیں۔

۳۷۔۔۔۔۔ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ: یعنی اللہ کی الہیت والوہیت کی شہادت کے ساتھ محمد عربی ﷺ کی نبوت و رسالت کی شہادت بھی اسلام کیلئے لازمی و ناگزیر ہے۔ ان دونوں شہادتوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسلئے کہ ان پر اسلام کا موقوف ہونا بدیہہ ظاہر ہے۔ یہ بات دھکی چھپی نہیں کہ کسی کی رسالت کی گواہی دینے سے پہلے چند باتوں کا علم ضروری ہے۔

(۱)۔۔۔۔۔ معطی رسالت (مرسل) کا علم۔

(۲)۔۔۔۔۔ صاحب رسالت (مرسل) کا علم۔

(۳)۔۔۔۔۔ صفت رسالت کا علم۔

(۴)۔۔۔۔۔ مقام رسالت کا علم۔

(۵)۔۔۔۔۔ مقام صاحب رسالت کا علم۔

(۶)۔۔۔۔۔ انتساب صفت رسالت بہ صاحب رسالت کا علم۔

۔۔۔۔۔ کلمہ توحید کے اس دوسرے جزء نے ان میں سے اکثر باتوں کی واضح طور پر نشاندہی کر دی ہے کہ دولت رسالت کو عطا فرما کر اپنا رسول بنانے والا ساری کائنات کا خالق قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہے۔ اور جن کو رسول بنایا وہ اس کے خاص الخاص بندے محمد عربی ﷺ ہیں۔ اور اللہ کے رسول ہونے کی نسبت ان کی ذات کی طرف قطعی ہے۔ اور جب وہ اللہ کے رسول ہیں تو اسی سے ظاہر ہو گیا کہ وہ اپنے مرتبہ و مقام کے لحاظ سے خود بھی بہت رفیع المنزلت ہیں۔ اور ان کی رسالت بھی بہت بلند پایہ ہے کیونکہ کسی پیغام رساں۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ اس کے پیغام کی عظمت و رفعت کا اندازہ اسی سے لگتا ہے کہ اولاً اس کی عظمت و برتری کو سمجھ لیا جائے جس کا وہ پیغام یا پیغامبر ہے۔ کیا روزِ مرہ کی زلزلہ میں یہ نہیں ہوتا کہ اگر کوئی پیغام کسی معمولی انسان کا آپ کو ملے تو آپ اس کی طرف کوئی خاص التفات نہیں کرتے۔ مگر انہیں الفاظ و کلمات کے ساتھ بعینہ وہی پیغام اگر گورنر کی طرف سے آپ تک پہنچے، پھر تو اسے آپ اپنی آنکھوں میں رکھیں گے اور سر پر چڑھائیں گے۔ اور اپنے مقدر پر ناز کریں گے کہ گورنر نے ہم کو یاد فرمایا ہے۔ اور اگر یہی پیغام آپ کو صدرِ جمہوریہ کی طرف سے ملے، پھر تو گورنر کو بھی آپ خاطر میں نہ لائیں گے۔ اور اپنے کو وقت کا سب سے بڑا خوش نصیب اور مقدر کا ذہنی تصور کریں گے اور اس پیغام کو سنہرے حروف میں تحریر کر کے حسین و جمیل فریم کے اندر رکھ کر مکان کے ممتاز مقام پر آویزاں کر دیں گے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ اس پیغام کے مندرجات پر عمل کو زندگی کا اولین فریضہ خیال فرمائیں گے۔

دیکھا آپ نے ایک بڑی ذات کی طرف سے کسی پیغام کا انتساب اس کو کتنی رفعت اور برتری اور کس قدر اہمیت عطا فرما دیتا ہے۔ یہی حال پیغامبر کا ہے۔ ایک معمولی انسان کا قاصد آیا آپ نے اس کی طرف کوئی توجہ بھی نہیں کی اور گورنر کا قاصد آیا تو آپ فرشِ راہ بنے جا رہے ہیں اور اگر کہیں صدرِ جمہوریہ کا قاصد آجائے، پھر تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آپ کی صورت حال کیا ہوگی؟ اخلاقی قدروں کو نمایاں کرنے میں آپ کے مقابلے کا عالم کیا ہوگا۔ آپ اپنے کو رفعت و برتری کے



لحاظ سے کس آسمان پر دیکھ رہے ہوں گے اور اس قاصد کی ایک ایک بات پر لیک وسعدیک کہنے میں آپ کس قدر عجلت اور تیزی سے کام لے رہے ہوں گے۔

دیکھا آپ نے یہ ہے انتساب کا جادو اور اس کی فسوں کاری۔ جیسی تو کہا جاتا ہے کہ نسبت بڑی چیز ہوتی ہے۔ رہ گئی ’صفت رسالت‘ تو اس کے اصطلاحی معنی کی معرفت جو اہر پارہ نمبر ۳۱ میں کرا دی گئی ہے۔ اب اس مقام پر قرآن کریم کی روشنی میں یہ واضح کر دینا مناسب نظر آ رہا ہے کہ اللہ کے رسول کی رسالت کتنے کمالات جلیلہ اور صفات حمیدہ کی حامل ہے، تاکہ روشن ہو جائے کہ اللہ کے رسول کا اور اس رسول کی رسالت کا مقام کیا ہے؟

اس سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ رسول کی رسالت کی شہادت کے معنی کی وضاحت ہو جاتی ہے اور یہ اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ رسول کی رسالت کی گواہی کا معنی یہ ہے کہ رسول کے ان تمام صفات و کمالات کی شہادت دی جائے جو دامن رسالت سے وابستہ ہیں۔ اس صورت میں اس گواہی کو رسالت کی گواہی کہیں گے۔ ایسا نہیں کہ چاند کی گواہی دیں، اور چاندنی کا انکار کریں۔ آفتاب کی شہادت دیں، اسکی روشنی سے انکار کریں۔ دریا کو مانیں، روانی کو نہ مانیں۔ آگ کو تسلیم کریں، حرارت کے منکر ہو جائیں۔ یا اسکے بالکل برعکس طلوع شمس کی بھی شہادت دیں، اور وجود شب کی بھی وغیرہ وغیرہ۔ تو جس طرح چاند مان کر چاندنی نہ ماننا، سورج مان کر دن نہ ماننا، دریا مان کر روانی نہ ماننا، آگ مان کر حرارت نہ ماننا، چاند، سورج، دریا اور آگ ان سب کا انکار ہے، اسی طرح رسالت کو مان کر اسکے لازمی صفات کو نہ ماننا، درحقیقت رسالت ہی کا انکار ہے۔ یونہی جس طرح سورج مان کر رات کا وجود ماننا اور آگ مان کر برودت ماننا بھی سورج اور آگ کا انکار ہے۔ اسی طرح رسالت کو مان کر اسکے ساتھ منافی رسالت صفات ماننا سرے سے رسالت ہی کا انکار ہے۔

کسی چیز کے انکار کی تین صورتیں ہیں:

۱۔۔۔۔ اس کا براہ راست انکار کر دیا جائے۔

۲۔۔۔۔ اس کی کسی لازمی صفت کا انکار کر دیا جائے۔

۳۔۔۔۔ کسی ایسی چیز کو مان لیا جائے جو اس کے وجود کے منافی ہو۔

مثلاً: سورج کے انکار کی ایک صورت یہ ہے کہ کہا جائے کہ سورج موجود نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کہا جائے دن موجود نہیں اور تیسری صورت یہ ہے کہ کہا جائے رات موجود ہے۔ رسول کے مقام و مرتبہ کی وضاحت سے دوسرا فائدہ یہ رہے گا کہ کوئی مخلوق اپنے قاصد واپسی کو اللہ کے رسول پر، اللہ کے رسول کو قاصد واپسی پر قیاس کرنے کی جرأت نہ کر سکے گی۔ یہ خیال رہے کہ اس مقام پر اللہ کے رسول کی انہی صفات کا ذکر کیا جائے گا جو آپ کو بہت رسالت سے عطا کی گئیں ہیں۔

فاضل جلیل علامہ سید محمود احمد صاحب نے ’فیوض الباری فی صحیح بخاری‘ میں رسول کے مرتبہ و مقام سے متعلق جو مضمون تحریر فرمایا ہے وہ مختصر ہونے کے باوجود کافی مفید ہے اس مقام پر اس کو من وعن نقل کر دینا کافی ہے۔

مَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ط ﴿سورۃ النساء: ۶۴﴾  
ہم نے جو رسول بھیجا ہے، اسی لئے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کے ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، یہ نہیں کہ صرف اس کو اللہ کا رسول مان لیا جائے۔ پھر اطاعت رسول کا جہاں جہاں حکم آیا ہے بالکل مطلق ہے، اس میں کوئی قید نہیں ہے، کہ فلاں امور میں تو رسول کی اطاعت کرو اور فلاں میں نہیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول ایک حاکم عام ہے جو حکم بھی دے اس کا ماننا لازمی ہے۔ قرآن نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ رسول کی اطاعت، اللہ کی اطاعت کی طرح ہے۔ رسول کی اطاعت ایک عام انسان کی اطاعت کی طرح نہیں ہے، جیسا کہ جاہل کفار کا خیال تھا جو کہتے تھے۔

هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ج ﴿سورۃ الانبیاء: ۳۰﴾  
کیا یہ تم جیسا ایک بشر نہیں ہے

وَلَقِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذَا لَخَسِرُونَ ز ﴿سورۃ المؤمن: ۳۳﴾  
اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو تم ضرور ٹوٹے میں رہو گے۔

قرآن نے جاہل کفار کے اس خیال کی تردید کر دی اور مومنوں کو یہ اطمینان دلایا کہ رسول کی اطاعت عام انسانوں کی اطاعت کی طرح نہیں، بلکہ دراصل خدا کی اطاعت ہے۔

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۚ ﴿سورة النساء: ۸۰﴾

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ رسول منجانب اللہ امام اور ہادی ہوتا ہے اور ہر اختلاف اور نزاع کی صورت میں رسول کو حکم بنانا اسی طرح ضروری ہے جس طرح خدا کو۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يَتَّبِعُونَ بِأَمْرِنَا ﴿سورة الانعام: ۷۳﴾

ہم نے انبیاء کو امام بنایا ہے وہ ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے ہیں۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۚ

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ ﴿سورة النساء: ۵۹﴾

اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اولی الامر کی، جو تم میں سے ہوں۔

پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو تو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔

فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ کافقرہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ مسائل شرعی میں جب مسلمانوں کے درمیان اختلاف واقع ہو تو حکم ہے کہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کریں۔ اس میں خدا اور رسول دونوں کو حکم بنانے کا حکم ہے۔ اگر مرجع بالکل قرآن مجید ہوتا تو فرودہ الی اللہ کہنا کافی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ والہ رسول بھی کہا گیا ہے، جس میں صاف وضاحت ہے کہ قرآن کے بعد رسول کا طریقہ ہی مرجع ہے۔ اور دین کے اصلی دو جز قرآن اور حدیث ہی ہیں۔

قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا کہ رسول کریم ﷺ کے فیصلہ کو دل و جان سے ماننا ہر ایمان کیلئے فرض، بلکہ شرط ایمان ہے۔ جو شخص رسول کے فیصلہ کو نہ مانے وہ بے ایمان ہے۔

فَلَا وَرَيْكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔۔۔۔ ﴿سورة النساء: ۶۵﴾

اے رسول تیرے رب کی قسم یہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک

اپنے تمام معاملات میں تمہیں حکم نہ مان لیں۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ

أَمْرًا أَنْ يُكُون لَّهُمْ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ ﴿سورة الاحزاب: ۳۶﴾

کسی مرد مومن اور عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دیں تو

پھر ان کو اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔

یہاں کسی زمانے کی قید نہیں ہے، مومن و مومنہ سے صرف عہد نبوی کے مومن مرد و

عورت مراد نہیں ہیں بلکہ قیامت تک کے ہیں، امرًا کا لفظ نہایت عام ہے جو ہر قسم کے معاملات پر حاوی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہر کام، ہر بات میں خدا اور رسول کے فیصلہ کو تسلیم کرنا فرض ہے۔ قرآن نے یہ بھی اعلان کیا کہ اللہ کی طرح اسکے رسول کو بھی ساری دنیا کی چیزوں سے محبوب رکھنا ضروری ہے۔ جو ایسا نہ کریں وہ فاسقین سے ہیں اور اللہ کی ہدایت سے محروم ہیں۔ جب اللہ اور رسول کسی کام کی دعوت دیں اور پکاریں تو اس پر لبیک کہنا ہر مومن کیلئے فرض ہے۔

أَحَبُّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي

سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ط ﴿سورۃ التوبہ: ۲۴﴾

اگر یہ دنیا تمکو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہے تو اللہ کے امر (غذاب) کا انتظار کرو

اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ ﴿سورۃ الانفال: ۲۴﴾

اللہ اور اس کے رسول جب تم کو آواز دیں تو فوراً لبیک کہو۔

اور یہ بھی مومن وہی ہیں جو اللہ اور رسول کے حکم پر لبیک کہتے ہیں اور اللہ و رسول دونوں کی اطاعت کرتے ہیں۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ

لِيُحْكَمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ط ﴿سورۃ النور: ۵۱﴾

ایمان والوں کو جب اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف

بلایا جائے تاکہ اللہ اور رسول ان کے درمیان فیصلہ دیں تو ان

کا جواب سوا اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ کہیں سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا۔

۔۔۔ قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ کسی شخص کی کامیابی اور فوز و فلاح کیلئے جس طرح اللہ کی اطاعت ضروری ہے اسی طرح رسول کی اطاعت بھی فرض ہے۔ جس طرح اللہ کی نافرمانی گمراہی و بدبختی ہے اسی طرح رسول کی نافرمانی کا حال ہے۔

مَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿سورۃ الاحزاب: ۷۱﴾

جس نے اطاعت کی اللہ کی اور اس کے رسول کی اُس نے بڑی مراد کو پالیا۔

مَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا ط ﴿سورۃ الاحزاب: ۳۶﴾

جس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی پس وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔

قرآن نے یہ بھی ہدایت دی ہے کہ مسلمانوں کو رسول کی نافرمانی کی کوئی بات بھی آپس میں نہیں کرنی چاہئے۔ ایک مؤمن پر اس کی جان کا جتنا حق ہے اس سے کہیں زیادہ اس پر نبی کا حق ہے۔ اور اللہ کے ساتھ نبی کو راضی کرنا بھی ضروری ہے بلکہ شرط ایمان ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا إِلَّا نَحْمًا

وَالْعُلْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ ﴿سورة المجادلة: ۹﴾

اے ایمان والوں جب تم چپکے چپکے بھی کوئی بات کرو تو گناہ، زیادتی اور ظلم، رسول کی نافرمانی کی کوئی بات نہ کرو۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ ﴿سورة الاحزاب: ۶﴾

نبی مؤمنین سے ان کی جانوں سے زیادہ قریب ہیں

یا۔۔۔ (نبی مؤمنین کے ان کی جانوں سے زیادہ مالک ہیں)

وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ إِنَّ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿سورة الاحزاب: ۲۳﴾

مؤمنین کیلئے اللہ کے ساتھ اس کے رسول کو بھی راضی کرنا ضروری ہے۔

قرآن نے ان منافقین کی مذمت بھی کی جو اپنی خود غرضی اور منافقت کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں کوتاہی کرتے ہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَىٰ الرَّسُولِ

رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُفُّونَ عَنْكَ وَدَاٰ ﴿سورة النساء: ۶۱﴾

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کتاب کی طرف جس کو

اللہ نے نازل کیا، اور رسول کی طرف آؤ، تو اے رسول تو دیکھے گا

ان منافقوں کو کہ اعتراض کرتے ہیں تیری طرف سے۔

اس آیت میں رسول کی اطاعت کا جس طرح حکم دیا گیا ہے وہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ رسول کی اطاعت مستقل طور پر فرض ہے دیکھئے ما انزل اللہ تو کتاب ہے لیکن والی الرسول یہ کتاب نہیں ہے۔ یہ تو رسول کی مستقل طور پر اطاعت کا حکم ہے۔

قرآن نے یہ بھی اعلان کیا کہ کفار دوزخ میں ڈالے جانے کے بعد جس طرح اللہ کی نافرمانی پر کف افسوس ملیں گے اسی طرح رسول کی نافرمانی پر بھی افسوس کریں گے۔

يَوْمَ تَقْلُبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَلَيْتَنَّا

أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَ ﴿سورة الاحزاب: ۶۶﴾



جس دن انکے مندا لٹ الٹ کر آگ میں تلے جائینگے تو کہتے ہو گئے

ہائے کسی طرح ہم نے اللہ کا حکم مانا ہوتا اور رسول کا حکم مانا ہوتا۔

اگر رسول کی اطاعت ایک مستقل اطاعت نہیں تھی تو پھر اللہ اور رسول کی اطاعت کو علاحدہ علاحدہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ رسول کی اطاعت غیر مشروط اور غیر محدود طور پر ہے۔ اس میں کسی زمانے کی قید نہیں ہے۔ اور رسول مستقل طور پر خدا کی طرح مطاع ہے۔ فرق یہ ہے کہ رسول کی اطاعت خدا ہی کے حکم اور اذن سے کی جاتی ہے۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ﴿سورة النساء: ۵۹﴾

اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی

یہاں أَطِيعُوا الرَّسُولَ کو أَطِيعُوا اللَّهَ سے الگ ایک مستقل جملہ کی شکل میں لایا گیا ہے جس سے اس امر کی وضاحت مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت بھی مستقل طور پر فرض ہے۔ اور اگر اس کا یہ مطلب ہوتا کہ بس رسول جو کتاب لائے ہیں اسکو مانا جائے تو اطیعوا اللہ کہنا ہی کافی تھا، اطیعوا الرسول کے اضافہ کی ضرورت نہ تھی۔

قرآن نے یہ بھی بتایا کہ رسول کی مستقل طور پر اطاعت اسلئے ضروری ہے کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وہ خدا کی ہدایت اور اسکی وحی کے ماتحت کہتا ہے۔ وہ اپنے نفس کی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتا اسلئے تم کو مطمئن ہو جانا چاہئے کہ رسول کی پیروی میں کسی قسم کی گمراہی اور غلط روی کا خطرہ نہیں ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَى ۚ وَمَا يَنْطِقُ

عَنِ الْهَوَى ۚ إِنَّ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى ۚ ﴿سورة البقرہ: ۲۲۳﴾

تمہارے صاحب (محمد ﷺ) نہ گمراہ ہوئے اور نہ گمراہی سے غوی ہوئے، وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے، وہ جو کچھ کہتے ہیں وحی سے کہتے ہیں جو ان پر کی جاتی ہے۔

إِنَّ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى میں ہو، کی ضمیر نطق رسول کی طرف لوٹتی ہے۔ جسکا ذکر مانتی نطق میں کیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے کہ نطق رسول کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جائے۔ یہاں تو ہر اس بات کو وحی الہی قرار دیا گیا ہے، جس پر نطق رسول کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، جس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول کا نطق (بولنا) خالص وحی سے ہوتا ہے اور اس میں رسول کی خواہش کو قطعاً دخل نہیں ہوتا۔

وَاللّٰهُ يَعْصِيكَ مِنَ النَّاسِ ط

(سورۃ النامہ ۶۷)

----- یعنی ----- اللہ تعالیٰ تم کو لوگوں کی دست برد سے بچائے گا

----- اس آیت کا صرف یہی مطلب نہیں کہ جسم نبوی کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جائے گا۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ رسول کریم ﷺ کا وجود مبارک اللہ کی حفاظت میں ہے۔ اسلئے نبی کریم ﷺ کی آنکھیں اور ان کی زبان حق دیکھتی اور حق ہی کہتی ہیں۔ اور نبی دین سے متعلق جو کچھ فرماتا ہے وہ منشاء ایزدی کی ترجمانی ہوتی ہے۔

ان آیات قرآنیہ نے بتا دیا کہ نبی صرف پیامبر ہی نہیں ہوتا بلکہ امر و نahi بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے قول و عمل سے نازل شدہ کتاب کے احکام کی جو تفسیر و تشریح اور توضیح فرماتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے منشاء کی ترجمانی ہوتی ہے اور دین سے متعلق رسول کا قول و عمل قرآن کی طرح غیر متبدل اور واجب العمل ہوتا ہے۔

دیکھا آپ نے علامہ موصوف کی تحریر کی روشنی میں نبی کریم پر جہت رسالت، جو فضل ربانی ہوا ہے، اس کے چند نمونوں کو۔۔۔۔۔ انہی سے اندازہ لگائیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی کا حصول نبی کریم کی کن کن صفات عالیہ اور کمالات لازمہ کی شہادت کے بعد عالم وجود میں آئے گی۔ رہ گئے وہ صفات کمالیہ جو فضل الہی نے اپنے محبوب کو 'جہت محبوبیت' عطا فرمائے ہیں ان کا تو شمار واحصاء مجھ جیسے بے بضاعت سے تو ناممکن ہے۔ جبکہ اچھے اچھے لوگ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔۔۔

بعد از خدا بزرگ تو کی قصہ مختصر

۳۸۔۔۔۔۔ ان تشهد۔۔۔۔۔ الخ: ظاہر حدیث سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ زبانی اقرار احکام کے اجراء کیلئے شرط ہے۔

۳۹۔۔۔۔۔ بخاری کی روایت میں ہے کہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهِ اس کا معنی یہ ہے کہ ان توحید اللہ ولا تشرك به شیئاً یعنی اللہ کو ایک جانور کسی کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔

۔۔۔۔۔ الحاصل۔۔۔۔۔ اس قول میں عبادت سے مراد توحید ہے۔ جس بھی شرک کو جو توحید کی

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط

﴿سورۃ المائدہ: ۶۴﴾

یعنی۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ تم کو لوگوں کی دست برد سے بچائے گا

۔۔۔۔۔ اس آیت کا صرف یہی مطلب نہیں کہ جسم نبوی کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جائے گا۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ رسول کریم ﷺ کا وجود مبارک اللہ کی حفاظت میں ہے۔ اسلئے نبی کریم ﷺ کی آنکھیں اور ان کی زبان حق دیکھتی اور حق ہی کہتی ہیں۔ اور نبی دین سے متعلق جو کچھ فرماتا ہے وہ منشاء ایزدی کی ترجمانی ہوتی ہے۔

ان آیات قرآنیہ نے بتا دیا کہ نبی صرف پیامبر ہی نہیں ہوتا بلکہ امر و نہی بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے قول و عمل سے نازل شدہ کتاب کے احکام کی جو تفسیر و تشریح اور توضیح فرماتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے منشاء کی ترجمانی ہوتی ہے اور دین سے متعلق رسول کا قول و عمل قرآن کی طرح غیر متبدل اور واجب العمل ہوتا ہے۔

دیکھا آپ نے علامہ موصوف کی تحریر کی روشنی میں نبی کریم پر جہت رسالت، جو فضل ربانی ہوا ہے، اس کے چند نمونوں کو۔۔۔۔۔ انہی سے اندازہ لگائیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی کا حصول نبی کریم کی کن کن صفات عالیہ اور کمالات لازمہ کی شہادت کے بعد عالم وجود میں آئے گی۔ رہ گئے وہ صفات کمالیہ جو فضل الہی نے اپنے محبوب کو 'جہت محبوبیت' عطا فرمائے ہیں ان کا تو شمار و احصاء مجھ جیسے بے بضاعت سے تو ناممکن ہے۔ جبکہ اچھے اچھے لوگ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔۔۔

بعد از خدا بزرگ تو کی قصہ مختصر

۳۸۔۔۔۔۔ ان تشهد۔۔۔۔۔ اع: ظاہر حدیث سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ زبانی

اقرار احکام کے اجراء کیلئے شرط ہے۔

۳۹۔۔۔۔۔ بخاری کی روایت میں ہے کہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهِ اس کا معنی یہ

ہے کہ ان توحید اللہ ولا تشرك به شیئاً یعنی اللہ کو ایک جانو اور کسی کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔

۴۰۔۔۔۔۔ الحاصل۔۔۔۔۔ اس قول میں عبادت سے مراد توحید ہے۔۔۔۔۔ جسہی شرک کو جو توحید کی

خُذْ، اس کا مد مقابل قرار دیا گیا ہے۔ لہذا اس کا بھی حاصل مراد وہی رہا جو 'ان تشہدان لا الہ الا اللہ' کا حاصل مدعا ہے۔

۴۰۔۔۔ وَقِيمَ الصَّلَاةِ: یعنی کلمہ توحید کی شہادت کے بعد اسلام کا دوسرا رکن نماز ہے۔ اقامت صلوٰۃ کی مختصر اور جامع تشریح جواہر پارے کے تحت گزر چکی۔

فہرست  
تہذیب ہے کہ لو اعلیٰ الرچہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں، عین۔۔۔۔۔ بایں ہمہ۔۔۔۔۔ وہ ارکان اسلام  
سے نہیں، کہ ان پر دعوت اور چٹکی لازمی ہو۔

۴۱۔۔۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم کی دو معراج ہوئیں: ایک عالمِ جس میں اور دوسری عالمِ ارواح میں۔

عالم جس کی معراج کا آغاز مسجد حرام سے ہوتا ہے، جس کی پہلی منزل مسجد اقصیٰ ہے اور دوسری منزل عالم ملکوت ہے اور تیسری منزل محل ملاء اعلیٰ ہے۔ اور عالم ارواح کی معراج کی ابتداء عالم شہادت سے ہوتی ہے، جس کی پہلی منزل عالم غیب ہے اور دوسری منزل بارگاہ غیب الغیب ہے۔ جب حضور نبی کریم نے معراج سے واپسی کا ارادہ کیا تو رب تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جب مسافر اپنے وطن کی طرف پلٹتا ہے، تو اپنے اصحاب کیلئے کوئی نہ کوئی تحفہ لے جاتا ہے۔ لو یہ نماز تمہاری امت کیلئے ایک گراں قدر تحفہ الہیہ ہے جو معراج جسمانی اور معراج روحانی، دونوں کی جامع ہے۔

یعنی اسکے آداب و افعال کو جسمانی معراج کی حیثیت حاصل ہے اور اسکے احوال و اذکار کو روحانی معراج کا مقام حاصل ہے۔ اسی بناء پر ایک روایت میں ہے:

‘الصَّلَاةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِينَ’

نہاز مؤمنین کی معراج ہے۔

۔۔۔۔۔ تجھ نبی کریم کو امت کیلئے اس وقت عطا فرمایا گیا جبکہ آپ ۔۔۔۔۔ ذَنٰی فَقَدَلٰی فُكَاۡنَ  
فَابَ قَوْسَيْنِ اَوَّادْنٰی ۔۔۔۔۔ کی منزل قرب الہی میں تھے، تو مولیٰ تعالیٰ نے آپ کی امت کو وہ  
تجھ عطا فرمایا جس کے ذریعہ قرب خداوندی کے انوار کے فیوض و برکات حاصل ہوتے رہیں۔

نماز کی برتری اور بہتری کو نمایاں کرنے کیلئے اس مذکور بالا تحریر کے بعد اب اور کیا چاہئے۔ باقی تفصیلات اپنے موقع پر آئیں گی۔۔۔۔۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

۳۲۔۔۔۔۔ وَتَوَنَّى الزُّكُوةَ: بخاری و مسلم کی روایت میں ’الزُّكُوةَ‘ کے ساتھ ’المفروضہ‘ کی قید بھی ہے جو محض تاکید کیلئے، اسکا منشاء یہ نہیں ہے کہ کوئی ’زکوٰۃ نافلہ‘ بھی ہوتی ہے۔ زکوٰۃ اس قدر معین کا نام ہے جو نصاب سے بہ نیت زکوٰۃ نکالی گئی ہو، اس قدر مخرج کو زکوٰۃ اسلئے کہتے ہیں کہ اس سے نصاب اور صاحب نصاب دونوں کی تطہیر ہوتی ہے۔ جیسا کہ جواہر پارے کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔ صوفیہ کے نزدیک زکوٰۃ سے ترک اموال کے ذریعہ ظاہر و باطن کے احوال کے تزکیہ کی طرف اشارہ ہے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ قلب کو اغیار سے خالی کر لیا جائے تاکہ روح کو تخلیہ میسر ہو اور اس پر انوار الہیہ کی تجلیات کا ظہور ہو۔

۳۳۔۔۔۔۔ وَتُصُومُ رَمَضَانَ: یہاں رمضان سے مراد شہر رمضان یعنی ماہ رمضان ہے۔ اس سے لفظ ’شہر‘ کے ذکر کے بغیر رمضان کے ذکر کے ’جواز بے کراہت‘ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہو چکا ہے کہ رمضان ’رمض‘ سے ماخوذ ہے اور ’رمض‘ گرمی کی جلن کو کہتے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ وجہ تسمیہ سے متعلق مختلف احتمالات ہیں جن میں بعض کا جو ذکر جواہر پارے کے تحت گزر چکا، ان بعض کے علاوہ بعض امکانات یہ ہیں۔۔۔۔۔ ۱۔۔۔۔۔ چونکہ حالت صوم میں صائم بھوک و پیاس کی گرمی سے گویا جل اٹھتا ہے لہذا ماہِ صوم کو ماہِ رمضان کہہ دیا گیا۔

۲۔۔۔۔۔ چونکہ صوم سے گناہ جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں اور عیوب محو ہو جاتے ہیں، مٹ جاتے ہیں، اس وجہ سے ماہِ صوم کو ماہِ رمضان کہہ دیا گیا۔

۳۔۔۔۔۔ چونکہ صوم سے شہوات و خواہشات کی حرارت زائل ہو جاتی ہے۔ یعنی شہوات کی دنیا میں آگ لگ جاتی ہے جس سے ان کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اسلئے ماہِ صوم پر ماہِ رمضان کا اطلاق کیا جانے لگا۔۔۔۔۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

۳۴۔۔۔۔۔ صوم شریعت کے منافع، حدود حساب سے باہر ہے اور بالقرض اگر کوئی بھی نفع نہ ہوتا تو یہی کیا کم ہے کہ صائم کو صوم کے ذریعہ علماء اعلیٰ سے تقبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور پھر



صوم کو وہ مقام حاصل ہے کہ رب ﷻ ارشاد فرماتا ہے:

الصَّوْمُ لِي وَأَنَا أُجْزَى بِهِ (حدیث قدسی)  
روزہ میرے لئے ہے اور میں خود اس کی جزا دوں گا  
میں خود اس کی جزا ہوں

-----یا-----

-----اجزی کو معروف پڑھئے یا مجہول، دونوں صورتوں میں روزہ کی بے پناہ عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

۴۵۔۔۔۔۔ اہل طریقت کے نزدیک صوم 'الْأَمْسَاكُ عَنِ الْاَكْوَانِ وَالْاَفْطَارِ بِمَشَاهِدَةِ الرَّحْمَنِ' کا نام ہے۔ یعنی اکوان سے اپنے کو روکنا اور مشاہدۃ جمال الہی سے لذت آشنا ہونا صوم طریقت ہے۔

۴۶۔۔۔۔۔ وَتُحِجُّ الْبَيْتَ۔۔۔۔۔ الع 'البیت' میں الف لام عہد کا ہے، جس سے مراد 'البیت الحرام' (خانہ کعبہ) ہے۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ البیت اسم جنس ہے۔ جس کا غالب استعمال بطور علم، خانہ کعبہ کیلئے ہونے لگا۔ اس صورت میں النجم کی طرح البیت کا الف لام جز کلمہ ہوگا۔

سبیل اس راستے کا نام ہے جس میں سہولت ہو، مگر اس کا استعمال ہر اس چیز کیلئے ہونے لگا جس کو کسی شے کی طرف پہنچنے کا حیلہ بنایا جائے: سَبِيلًا إِلَيْهِ کے بجائے إِلَيْهِ سَبِيلًا فرمایا گیا، تاکہ اختصاص کا فائدہ حاصل ہو۔ اس صورت میں حاصل کلام یہ ہوگا کہ توجہ کرے بیت اللہ کا، اگر وہاں تک پہنچنا تیرے لئے کسی بھی راہ سے ممکن ہو، خواہ قریب کی راہ ہو یا دور کی۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ راہ بیت حرام ہی کی طرف پہنچانے والی ہو، کسی اور طرف نہ لے جائے۔

۴۷۔۔۔۔۔ اس مقام پر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ استطاعت جس سے مکلف فعل طاعت و عبادت پر قادر ہو سکے اور اطاعت و عبادت کے وجوب کی ادائیگی سے اپنے کو سبکدوش کر سکے وہ تو جملہ ارکان اسلامیہ میں مشروط ہے۔ پھر حج ہی کے ساتھ اس استطاعت کو کیوں مخصوص کیا گیا۔

-----الختصر۔۔۔۔۔ استطاعت تو ہر عمل کیلئے شرط ہے پھر حج کے ساتھ خصوصی طور پر اس کے

ذکر کی کیا ضرورت ہے؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ 'فريضة حج' میں جس استطاعت کو مشروط قرار دیا گیا ہے، اس کا ایک خاص معنی ہے۔ اور وہ ہے 'زاو راہ اور سواری'۔۔۔۔۔ الغرض۔۔۔۔۔ زادور احلتہ کی تعبیر استطاعت سے کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی استطاعت دوسرے ارکان اسلامیہ میں

مشروط نہیں ہے۔۔۔۔۔ بلفظ دیگر۔۔۔ استطاعت کا معنی ہے قدرت۔

اسکا اطلاق اسباب و آلات کی صحت و سلامتی پر بھی ہوتا ہے اور جو ہر حیوان کے اس عرض پر بھی جس کے ذریعہ حیوان اپنے اختیاری افعال کے صادر کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ استطاعت بمعنی اول کبھی کبھی فعل پر مقدم ہو جاتی ہے۔ مگر استطاعت بمعنی ثانی فعل کے ساتھ ساتھ ہی رہتی ہے۔ اور حج میں جو استطاعت بطور شرط مطلوب ہے وہ استطاعت بمعنی اول ہے۔

۳۸۔۔۔ استطاعت بمعنی زادوراحلہ کی قید شاید اسلئے لگائی ہو کہ کچھ لوگ ایسے تھے جو زادوراحلہ کے فقدان کو سفر حج کیلئے مانع نہیں قرار دیتے تھے اور حجاج کو مشقت و صعوبت میں ڈال دیتے تھے تو استطاعت زیر بحث کی قید کو ظاہر کر کے ایسوں کو ان کی اس حرکت سے روک دیا گیا۔  
یہ کہ علم الہی میں تھا کہ آخری زمانہ میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو مذکورہ بالا حرکت کا ارتکاب کریں گے۔ تو تمام بندوں کی سہولت کیلئے مولیٰ تعالیٰ نے صراحتاً اس قید (یعنی استطاعت) کا ذکر فرمایا۔ تاکہ غیر مستطیع لوگ اپنے کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالیں۔

باوجود اسکے کتنے ایسے لوگ ہیں جو اس 'نفسِ جلی' پر غور نہیں کرتے اور اپنے کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور غیر مستطیع ہونے کے باوجود سفرِ حج کی صعوبت و مشقت کو اٹھاتے ہیں۔

اس بات کا بھی احتمال ہے کہ شاید اس میں (یعنی استطاعت کے صراحۃً ذکر میں) حکمت یہ ہو کہ اس صورت میں یہ آیت کریمہ صراحۃً تازیانہ و عبرت ہو جاتی ہے اُن اغنیاء کیلئے جو مال و اثاثہ رکھنے کے باوجود تاسکیر کن گج سے ہیں۔

۳۹۔۔۔ توحید مطلوب ہے اور وہ بھی ایسی مطلوب ہے جسے پوری زندگی کے کسی لمحے میں بھی اپنے سے الگ کرنے کی اجازت نہیں۔ نماز مطلوب ہے مگر دن میں فقط پانچ وقت کی۔ روزہ مطلوب ہے مگر سال میں صرف تیس دن کا۔ زکوٰۃ مطلوب ہے مگر سال میں صرف ایک بار اور حج مطلوب ہے مگر عمر میں صرف ایک بار۔ تو چاہئے یہ تھا کہ جواب میں یہی ترتیب ملحوظ خاطر رکھی جاتی ’اولئى فالاولئى‘ کے اصول پر یعنی پہلے ذکر تو حید پھر ذکر صلوٰۃ پھر صوم پھر ذکر زکوٰۃ اور پھر ذکر حج۔ ارشادِ گرامی میں ترتیب تو قریب قریب یہی ہے، ہاں صرف اتنا فرق ہے کہ ذکر زکوٰۃ کو ذکر صوم پر مقدم کر دیا گیا ہے، شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ صوم و صلوٰۃ دونوں عبادتِ بدنی سے ہیں، اور

زکوٰۃ عبادت مالی سے۔ تو ایک عبادت بدنی، یعنی نماز کا ذکر جب شروع میں ہو گیا تو اسکے بعد فوراً عبادت مالی، یعنی زکوٰۃ کا ذکر مناسب خیال کیا گیا۔

قرآن کریم میں جا بجا نماز کے ذکر کے بعد فوراً زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے۔ تو نماز کے بعد زکوٰۃ کے ذکر میں خیر الکلام کی اقتداء بھی ہو جاتی ہے۔ بعض روایت میں حج کا ذکر نہیں۔ بعض میں صوم کا ذکر نہیں۔ بعض میں صرف شہادتین کا ہی ذکر ہے۔ اور بعض میں صرف صلوٰۃ و زکوٰۃ ہی کا ذکر ہے۔ اس ذکر و عدم ذکر سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ روایتیں آپس میں متخالف و متضارب ہیں اسلئے کہ مفصل روایت کے سامنے غیر مفصل روایت کو راوی کے ذہول و نسیان پر مبنی قرار دیا جائے گا۔ یا یہ کہا جائے گا۔۔۔ لِحُلِّ وَجْهَةٍ۔۔۔ ہر راوی کا اپنا ایک رخ ہے۔ ایک نقطہ نظر ہے اور ہر ایک کا ایک الگ اسلوب بیان ہے۔ لہذا بعض نے روایت کو جوں کا توں بیان کر دیا۔ بعض نے ذکر حج کو حذف کر دیا، اس خیال سے کہ اس کا وجوب نادر ہے اور عمر میں صرف ایک بار ہے۔ بعض نے صوم کو حذف کر دیا، اس خیال سے کہ صوم و صلوٰۃ دونوں عبادت بدنی ہیں تو جب ایک عبادت بدنی کا ذکر ہو گیا تو دوسری عبادت کے ذکر کی ضرورت نہ رہی۔

بعض نے صرف شہادتین کے ذکر پر انحصار کیا اسلئے کہ یہی دونوں تو اسلام کی بنیاد ہیں اور بعض نے صرف صلوٰۃ و زکوٰۃ کے ذکر پر اکتفا کیا، اس خیال سے کہ عبادت کی چند قسمیں ہیں۔ ایک بدنی اور ایک مالی اور وہ ایک وہ جس کا کچھ حصہ بدنی ہو اور کچھ حصہ مالی۔ اور چونکہ نماز عبادت بدنی میں ممتاز ہے اور زکوٰۃ عبادت مالی میں۔ لہذا انہی دونوں کا ذکر کافی ہے یہ دونوں سب کی نمائندگی کر رہی ہیں۔

۔۔۔ المختصر۔۔۔ کوئی بھی روایت ہو خواہ وہ نسبتاً مفصل ہو یا مختصر۔ ان کا مقصود یہ نہیں ہے کہ جملہ ارکان اسلام کو پورے پورے طور پر ایسا بیان کر دیا جائے کہ کسی کا ذکر نہ کر رہ جائے بلکہ مقصود صرف اتنا ہے کہ یہ ظاہر کر دیا جائے کہ اسلام، نام ہے طاعت و انقیاد و عبادت کا۔ یہ اور بات ہے کہ ارکان خمسہ دوسرے ارکان کے لحاظ سے افضل و برتر ہیں۔ تو خواہ ارکان خمسہ کا ذکر ہو یا انکے بعض کا، انکی حیثیت مثال کی ہوگی اور اس مثال سے باقی ارکان پر تنبیہ ہوگی۔ اسی لئے ایک روایت میں ہے:

وَتَتَمَّ وَتَغْتَسِلَ مِنَ الْجَنَابَةِ وَتَتَمَّ الْوُضُوءَ

--- الخاصل --- یہ اختلاف لفظی تحدیث معنوی پر محمول کی جائے گی۔

۵۰۔۔۔ اہل طریقت فرماتے ہیں کہ 'حج' سے اشارہ ہے کہ اللہ کے دوست اور غلیل پر بیت جلیل کی زیارت، استطاعت سمیل کی صورت میں واجب ہے۔ استطاعت کی صورت یہ ہے کہ سلوک کے جملہ شرائط و امکانات اور سفر کے جملہ آداب و ارکان موجود ہوں۔ ان آداب و ارکان وغیرہ میں بعض یہ ہیں۔

☆ رسوم و عادات سے خروج کا احرام ☆ مالوفات اور محبوب اشیاء سے علاحدگی ☆

☆ نیت و قلب کی صفائی سے اللہ تعالیٰ کی طرف کامل توجہ ☆ عرفات معرفت میں وقوف و گامزنی ☆

☆ جبل رحمت کی چوکت پر ہمیشہ لازم رہنا۔ یا یہ کہ جبل رحمت کی وادی کے گرد گرد چکر لگانا ☆

☆ کعبہ ربوہ بیت کے گرد طواف کرنا، پہنچنا طوار سے 'اطواف سبعہ'

(سات چکروں) کے ذریعہ نکلنے کے بعد ☆

☆ صفات کے صفا اور مروات کے مروۃ کے درمیان سعی ☆

☆ آثارِ عبدیت کے سیاہ داغوں کا انوار الہیہ کے اُسترے سے حلق وغیرہا ☆

۵۱۔۔۔۔۔ فَعَجَبْنَا لَهُ، يَسْأَلُهُ وَيُصَلِّعُهُ: تعجب کی زیادتی کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا

ہے کہ سرکارِ رسالت نے اپنے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا۔ لوگوں کو اس کا علم رسول کریم ہی کے ذریعہ ہو سکتا تھا اور اس آنے والے کی رسول کریم سے ملاقات کسی کے علم و معرفت میں نہ تھی۔ اور جب ملاقات ہی ثابت نہ تھی تو پھر رسول کریم سے کسی بات کے سننے کے ثبوت کا سوال ہی کیا ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔ بایں ہمہ۔۔۔۔۔ اس آنے والے آدمی نے سرکارِ رسالت کے ارشاداتِ عالیہ کی تصدیق کر کے ان امور سے اپنے باخبر ہونے کی طرف واضح اشارہ کر دیا تو کس قدر حیرت کی بات تھی کہ ایک آدمی رسول کریم سے سنے بغیر ان امور سے باخبر ہو جائے۔

۵۲۔۔۔۔۔ ایک روایت میں ہے۔۔۔۔۔ لَمَّا سَمِعْنَا قَوْلَ الرَّجُلِ صَدَقْتَ أَذْكَرُنَاهُ

یعنی اس آنے والے مرد کا سرکار کا جواب سن کر صدقت (آپ نے سچ کہا) کہنا ہم

لوگوں کو ناگوار خاطر ہوا۔

ایک دوسری روایت میں ہے ’اُنْظُرُوا نَسْلَهُ، وَبَصِدْهُ، كَأَنَّهُ، اَعْلَمَ مِنْهُ، وَكَيْفَ تَوَاقَبَ  
سے سوال بھی کر رہا ہے اور خود ہی تصدیق بھی کر رہا ہے۔ گویا کہ وہ آپ سے زیادہ خبر رکھتا ہے۔  
ایک تیسری روایت میں ہے مَآزًا يَنْسَا زَجْلًا مِثْلَ هَذَا كَأَنَّهُ، يَعْلَمُ رَسُولُ اللَّهِ  
سَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لَهُ، صَدَقْتَ صَدَقْتَ کہتا ہے۔ محسوس کیا آپ نے صحابہ کرام  
نے اس اضطراب کو جو ان روایتوں کے حجاب سے چھن چھن کر نکل رہا ہے۔ صحابہ کرام کی محبت  
ن چیز کو بھی برداشت نہ کر سکی کہ کوئی شخص رسول کی بارگاہ میں ایسا انداز کلام اختیار کرے جس سے  
علیٰ صبی برتری مترشح ہو۔

کہاں ہیں رسول کو اپنا جیسا تصور کرنے والے؟ انہیں اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنی  
چاہئے اور کہاں ہیں رسول کے مقابلے میں شیطان کی علمی برتری کا خطبہ پڑھنے والے اور علم رسول  
ن صبی و بہائم و جانین کے علوم سے تشبیہ دینے والے؟ انہیں صحابہ کرام کے اس طرز محبت سے سبق  
مائل کرنا چاہئے اور اپنی زبان تحریر کی مطلق العنانی۔۔۔ نیز۔۔۔ قلم کی ایمان سوز شوخی پر نادم و  
شرمندہ ہونا چاہئے اور کہاں ہیں صحافتی ادب کی آڑ لیکر محبوب رب العلمین کو ان پڑھ بادیہ نشین کہنے  
والے؟ انہیں اپنی صحافت بے جا پر شریعت حقہ کو قربان کرنے سے غیرت آنی چاہئے۔

۵۳۔۔۔ قَالَ فَاخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ: بخاری کی روایت میں ’مالا إيمان‘ ہے۔  
بخاری کی روایت پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ لفظ ’ما‘ سے ماہیت شے کے بارے میں سوال کیا جاتا  
ہے۔ لہذا جواب سوال کے مطابق نہیں۔ اس اشکال کو دو صورتوں سے دور کیا گیا ہے:

۱۔۔۔ سرکارِ مدینہ نے جواب میں سوال کے لفظوں کی رعایت نہیں فرمائی بلکہ  
سائل کے مقصد و مدعا کو نظر میں رکھ کر جواب مرحمت فرمایا۔ سرکار نے یہ جان لیا تھا کہ سائل ایمان  
کے متعلقات کی وضاحت چاہتا ہے کیونکہ سائل ’تعلیم حاضرین‘ کیلئے حاضر ہوا تھا۔ اور ظاہر ہے  
’تعلیم‘ کیلئے ’متعلقات ایمان‘ کی وضاحت زیادہ مناسب تھی۔

۲۔۔۔ متعلقات ایمان کے ذکر کے ضمن میں ماہیت ایمان (یعنی تصدیق) کا بھی  
ذکر ہو جاتا ہے۔

۳۔۔۔ سرکارِ رسالت کے ارشاد ’أَنَّى تُؤْمِنُ‘ میں ایمان سے ایمان کا معنی لغوی



مراد ہے۔ تو اب خواہ ماہیت ایمان کا سوال ہو یا متعلقات ایمان کا، دونوں صورتوں میں آپ کا جواب سوال کے مطابق ہے۔ یہ خیال رہے کہ ایمان کا معنی لغوی 'تصدیق' ہے۔

قاموس میں ہے۔ آمَنَ بِهِ إِيمَانًا أَيْ صَدَّقَهُ

۵۴۔۔۔ قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ: ایمان کے معنی کے ضمن میں اگر اعتراف کا مفہوم بھی شامل کر لیا جائے اور یوں کہا جائے۔ 'ان تصدق معترفاً' یہ کہ تصدیق کرے تو اعتراف کرتے ہوئے۔ یا یوں کہا جائے 'اَنْ تُعْتَرِفَ مُصَدِّقًا' یہ کہ اعتراف کرے تو تصدیق کرتے ہوئے۔۔۔۔۔ اقرار زبانی کے لازمی و ضروری ہونے کا بھی فائدہ حاصل ہو جائے۔

۵۵۔۔۔ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمل اور ہے، ایمان اور۔ اسلئے کہ پہلے اسلام کی تشریح کی گئی ہے، پھر ایمان کی۔ اور تصدیق کو ایمان قرار دیا گیا ہے۔

۵۶۔۔۔۔۔ باللہ: اللہ کی ذات و صفات کی توحید و تفرید کی۔ اسکے وجود کے وجوب کی اور اس کے جوہر کم کے ثبوت کی تصدیق۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ کے جملہ صفات کمالیہ، اسکی ذات کے جلال و جمال کا مقتضی ہیں، ایمان باللہ ہے۔

۵۷۔۔۔۔۔ جس صفت کا تصور کسی اور چیز کے تصور پر موقوف نہ ہو اس کو صفت حقیقیہ کہتے ہیں جیسے کہ 'حیات'۔ اور جس صفت کا تصور کسی اور چیز کے تصور پر موقوف ہو اس کو صفت اضافیہ کہتے ہیں۔۔۔۔۔ مثلاً۔۔۔۔۔ وجوب و قدم۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ صفات اکرام، صفات وجودیہ ہیں۔ اور صفات جلال 'صفات سلبیہ'۔۔۔۔۔ مندرجہ ذیل صفات، صفات وجودیہ ہیں۔  
حیات، علم، قدرت، ارادت، کلام، سمع، بصر، اور بقا۔

۵۸۔۔۔ ابن الصلاح کے بقول اس حدیث میں صرف اصل ایمان یعنی تصدیق اور اصل اسلام یعنی انقیاد کا بیان مقصود ہیں۔ اور اسلام کا حکم شہادتین ہی سے ثابت ہو جاتا ہے۔ اب رہ گیا ان اعمال کا ذکر جو حدیث زیر بحث میں مذکور ہیں۔ تو یہ محض اسلئے ہے کہ یہ سب اسلام کے ظاہر ترین شعائر سے ہیں۔

برہنہ تحقیق اسلام اور ایمان مفہوم کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اور مصداق کے اعتبار سے متحد، تصدیق نام ہے اعتقادِ لازم کا جو مطابق واقع اور متمنع الزوال ہے۔

۵۹۔۔۔۔۔ و ملفحجہ: اسکا غالب استعمال ان مجاہد علویہ نورانیہ کیلئے ہوتا ہے جو جسمانی کدورات سے پاک و مبرا ہوں۔ یہ اللہ اور انبیاء کرام کے مابین وساطت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض نے یہ تعریف کی ہے کہ یہ لطیف اور نورانی اجسام ہیں۔ جو مختلف اشکال میں متشکل ہونے کی قدرت رکھتے ہیں۔ تسبیح ربانی ان کیلئے ایسی ہی ہے جیسے ہماری سانس ہمارے لئے۔ تو جس طرح ہمیں سانس لینے میں دشواری نہیں، یوں ہی انھیں تسبیح الہی میں کوئی مشقت نہیں۔

اب ایمان بالملائکہ کا معنی یہ ہوا کہ جس کے اسماء ہم کو معلوم ہیں۔۔۔۔۔ مثلاً۔۔۔۔۔  
حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل، حضرت عزرائیل، انکے وجود کا تصدیقاً اعتقاد  
کریں اور جن کے اسماء معلوم نہیں تو ان کے وجود کا اجمالاً اعتقاد کریں اور اس بات کا اعتقاد کریں  
کہ یہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں جو رات دن اسکی تسبیح میں مشغول ہیں۔ اللہ پر نہ تو کوئی افتراء  
کرتے ہیں اور نہ اسکی نافرمانی کرتے ہیں۔ جو حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں اور انھیں میں سے  
حضرات کراما کا تین اور عرش کے مقرب حاملین ہیں۔ ان کیلئے بازو ہیں، کسی کے دو، کسی کے تین،  
اور کسی کے چار۔ وہ مذکور و مؤنث ہونے سے پاک ہیں۔ اور ان کے سوا جو کچھ کتاب و سنت سے  
فرشتوں کے متعلق ظاہر و ثابت ہے۔ ان سب کا بصورت علم، تفصیلاً اور بصورت عدم علم، اجمالاً  
اعتقاد کرنا ایمان بالملائکہ ہے۔

اس تفصیل کے اجمال کی طرف جواہر پارے میں اشارہ گزر چکا ہے۔

۶۰۔۔۔ و تحجبہ: اللہ کے رسولوں پر جو کتابیں نازل کی گئی ہیں، ان میں سے جن کا علم یقینی طور پر حاصل ہے، انکے وجود کا تفصیل، اور جن کا علم نہ ہوا انکے وجود کا اجمالاً اعتقاد، اور اس بات کا اعتقاد کہ تمام کتب آسمانیہ اور سابقہ صحف ربانیاہ کو قرآن کریم نے منسوخ کر دیا اور یہ کسی سے منسوخ نہ ہوگا اور نہ قیامت تک اسکے لفظوں میں کوئی تخریف ہو سکے گی۔

یہ ہے ایمان بالکتاب کا دوسرا گوشہ، پہلے کی وضاحت جواہر پارے میں ہو چکی ہے۔

۶۔۔۔۔۔ وُزْئِیْلَہ: ایمان بالرسول کا معنی یہ ہے کہ اس بات کی تصدیق کی جائے کہ اپنے رسولوں پر اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نازل فرمایا، انھوں نے محسن و خوبی اس کو قوم تک پہنچایا۔۔۔۔۔ نیز جن رسولوں کا وہ خود فطر قرآنی یا تو اتر سے معلوم ہو ان کا تفصیل اور جن کا نہ معلوم ہو ان کا اجمال

لیکن امام احمد کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی اور ہے رسول اور۔ روایت کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت ابو ذر نے نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول انبیاء کی کل تعداد کتنی ہے۔ سرکار نے ارشاد فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار، جن میں تین سو پندرہ رسول ہیں۔ رسولوں کے اس تقابلی ذکر سے رسول و نبی کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ جمہور کا بھی نقطہ نظر ہے کہ نبی و رسول کے مابین فرق ہے۔ اسلئے کہ نبی انسان مبعوث کو کہتے ہیں خواہ وہ صاحب وحی و کتاب ہو یا نہ ہو۔ اور رسول وہ انسان مبعوث ہے، جو صاحب وحی و کتاب ہو۔۔۔ لفظ دیگر۔۔۔ نبی انسان مبعوث کو کہتے ہیں خواہ وہ تبلیغ پر مامور ہو۔۔۔ الختم۔۔۔ ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں۔

۶۲۔۔۔ ایمان بالرسول کی تخصیص کی غالباً یہ وجہ ہو کہ رسول مبلغ ہونے کی حیثیت سے ایمان میں مقصود بالذات ہوتا ہے۔ رہ گیا 'ایمان بالنبی' تو اس کی معرفت رسول کی تبلیغ کی جہت سے ہوتا ہے۔ مگر اس مقام پر حاشیہ و خیال سے ایک سوال ابھرتا ہے، کہ انبیاء میں سے کچھ ایسے بھی تو ہیں جن کا ذکر رسول کریم سے نہیں کیا گیا۔۔۔ جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ط (سورۃ نساء: ۱۶۴) --- یعنی انبیائے کرام میں سے اگر بعض ایسے ہیں جن کا ذکر ہم نے تم سے کیا ہے تو ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔

--- تو جب ان کا ذکر کریں نہیں کیا گیا تو پھر ان کی معرفت و ایمان سے رسول کریم کی تبلیغ کس طرح متعلق ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس ذکر کی نفی ہے وہ ذکر تفصیلی ہے۔ لہذا اس سے ذکر اجمالی کی نفی نہیں ہوتی۔ یا جواب میں یہ کہا جائے کہ آیت کریمہ کا منشاء یہ ہے کہ وہی جلی کے ذریعہ ہم نے

ان کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ لہذا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وحی خفی کے ذریعہ بھی ذکر نہ کیا گیا ہو۔  
۶۳۔۔۔ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان بالرسول کا ذکر کافی تھا، اسلئے کہ کسی رسول پر ایمان لانے کیلئے یہ لازم ہے کہ اسکی پیش کردہ تمام ہدایتوں پر ایمان لایا جائے۔ پھر ایمان بالرسول سے پہلے ایمان باللہ ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب۔۔۔ نیز۔۔۔ ایمان بالرسول کے بعد ایمان بالیوم الآخر، اور ایمان بالقدر کے ذکر کی ضرورت کیا تھی۔

ان سب پر ایمان تو ایمان بالرسول کے دائرہ ہی میں آ جاتا ہے۔ جواباً کہا گیا ہے کہ اس مقام پر ان تمام کے ذکر سے مندرجہ ذیل ترتیب پر تنبیہ ہے۔ اور وہ ترتیب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملک کو کتاب کے ساتھ رسول کی خدمت میں بھیجا۔ مبدء و معاد و تقدیر کی خیر و شر کے منجانب اللہ ہونے کی معرفت کیلئے کتب و رسول کا ذکر پر ملائکہ کا ذکر اسی لئے مقدم کیا گیا ہے تاکہ ترتیب مذکور کی طرف اشارہ ہو جائے۔ اسلئے مقدم نہیں کیا ہے کہ ملائکہ رسول و کتاب پر افضل ہیں۔ اس مقام پر یہ ذہن نشین رہے کہ حضرات ملائکہ کا سرکار مدینہ کے سوا دوسرے انبیاء و مرسلین پر افضل ہونا مختلف فیہ ہے۔

معزز ملائکہ کو نبی کریم کے سوا تمام انبیاء پر افضل مانتے ہیں۔ رہ گئی ملائکہ کی کتب آسمانیہ پر افضلیت تو اس کا کوئی قائل نہیں۔ عالم تکلیف و وساکط کی حکمت ترتیب مذکورہ بالا کی مقتضی ہے۔  
در نہ میرے رسول کا تو مقام بلند وہ ہے جس کی طرف اس حدیث سے اشارہ ہے:

لِي مَعَ اللَّهِ وَقْتُ لَا يَسْمَعُنِي فِيهِ مَلَكٌ مَقْرَبٌ وَلَا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ

میرے لئے بارگاہ الہی میں قرب کی ایک ایسی منزل بھی ہے  
جس میں ملک مقرب کی گنجائش ہے اور نہ نبی مرسل کی پہنچ۔

۔۔۔ ترجمہ میں حدیث شریف کا حاصل مراد واضح کر دیا گیا ہے۔

۔۔۔ ملا علی قاری اس حدیث کو لکھ کر فرماتے ہیں:

فِيهِ إِشَارَةٌ إِلَى تَمَكُّنِهِ فِي وَقْتُ كَشْفِ الشَّاهِدَةِ وَاسْتِعْزَاقِهِ فِي  
بَحْرِ الْوَحْدَةِ حَيْثُ لَا يُتَقَبَّلُ فِيهِ إِلَّا الْبَشَرِيَّةُ وَالْكُونِيَّةُ وَهَذَا مَحَلُّ اسْتِقَامَتِهِ فِي  
مَشْهَدِ التَّمَكُّنِ الَّذِينَ أَخْبَرَ اللَّهُ عَنْهُ بِقَوْلِهِ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ وَلَيْسَ  
هُنَاكَ مَقَامُ جِبْرِائِيلَ وَجَمِيعِ الْكَرُوبِيِّينَ وَلَا مَقَامُ الصُّفَىٰ وَالْخَلِيلِ وَمَنْ

ذُوْنَهُمْ مِنَ الْآٰیٰتِ وَكَانَ اَكْثَرُ اَوْقَاتِهِ كَذٰلِكَ لٰكِنْ يَّرٰدُهُ اللّٰهُ اِلٰی تَادِيْبُ اٰمَنَةٍ  
فِيْ بَعْضِ الْاَوْقَاتِ لِیَجْزِيَ عَلَيْهِمْ اَحْكَامَ التَّلٰوِيْنَ وَلَا يَكْذِبُ فِيْ اَنْوَارِ  
الْكِبْرِیَاۤءِ الْاَزَلْ۔ (مرقاۃ)

اس میں اشارہ ہے کہ آپ کی تمکین و تابت قدمی کی طرف مشاہدۃ الہی کے ظہور کے وقت میں  
اور اس وقت میں جبکہ آپ بحر وحدت میں ایسا مستغرق ہو جاتے کہ بشریت و کونین کا کوئی اثر آپ  
میں باقی نہ رہتا۔ شہد الحکین یہ آپ کا وہی محل استقامت ہے جسکی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنے مبارک  
قول فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی سے دی ہے۔ یہاں نہ مقام جبریل ہے، نہ فرشتوں کا گذر اور  
نہ یہ صفی و خلیل کی منزل ہے اور نہ کسی اور نبی کی، سرور دو عالم اکثر و بیشتر اس عالم قرب میں رہتے تھے  
مگر بعض اوقات اللہ تعالیٰ امت کی تادیب و تعلیم کیلئے آپ کو اس عالم سے باہر بھی کر دیتا تھا تا کہ  
آپ ان پر احکام تلویں کا اجراء کریں۔ اور ازل کی کبریائی کے انوار میں گم کر دو جو نہ ہو جائیں۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے مرقاۃ اور اس کا مطلب خیز ترجمہ۔ اور دیکھا آپ نے کہ کیا مقام  
ہے رسول عربی کا۔ الفاظ و عبارت عاجز ہیں اس مقام اور اس وقت کے کوائف کی تصویر کشی کیلئے  
جس مقام پر اور جس وقت سرکار کا عالم یہ ہوتا تھا کہ آپ میں بشریت کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں نظر آتا  
تھا۔ جہاں ملک و نبی کا گذر نہ ہو وہاں وہم و خیال کے پہنچنے کا سوال ہی کیا ہے۔

۶۳۔۔۔ ایک یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی اور کو نبی ماننے کیلئے راضی نہیں۔  
ایک عیسائی کی عیسائیت حضرت عیسیٰ کے سوا سارے انبیاء کے انکار کے بعد بھی مجروح نہیں ہوتی۔  
مگر قربان جائیے رحمۃ اللعالمین و سید المرسلین پر جنہوں نے انبیاء سابقین کے ہر فرد پر ایمان کو اور ان  
کی تصدیق کو اسلام کا جزو لازمی قرار دے دیا ہے۔

لہذا یہ ناممکن ہے کہ کوئی کسی نبی کا منکر ہو کر مسلمان و مومن ہو سکے۔ یہ اسلام ہی ہے جسے  
جملہ انبیاء سابقین کی عظمت و رفعت کے پرچم کو بلند کرنے کا شرف حاصل ہے۔

۶۵۔۔۔ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ: آخری دن یعنی ایام دنیا کا آخری دن جو ایام آخرت کا پہلا  
دن ہے۔ اس توضیح پر احوال برزخ بھی یوم آخر کے وسیع مفہوم میں داخل ہو جائینگے۔۔۔۔۔ المختصر  
۔۔۔۔۔ یوم آخر کا آغاز اس دن سے ہوگا۔ جو اس محدود زمانے کا آخری دن ہے اور ایام آخرت کا پہلا  
دن۔ اور اس کی انتہا مومنین کیلئے دخول جنت اور کفار کیلئے دخول نار پر ہوگی۔ احوال آخرت میں  
کن کن امور کا شمار ہے، جو اھر پارے کے تحت ان کا بیان گذر چکا ہے۔



’یوم آخر‘ کیوں کہتے ہیں: اسکی ایک وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ یہ ایام دنیا کا آخری دن ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ ایام آخرت کا آغاز اسی دن سے ہوتا ہے تو یہ آخرت کا ابتدائیہ ہو گیا۔ لہذا اس کو یوم آخر کہہ دیا گیا۔ اور ایک تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ حساب و جزاء کو اس سے مؤخر کر دیا گیا، اسلئے اس کو یوم آخر کہتے ہیں، یعنی وہ دن، حساب و جزاء جس سے مؤخر ہو۔۔۔۔۔ یوم آخر کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ دن جس کو اوقات محدودہ سے مؤخر ہونے کے سبب ایسی ابدیت و پیچیدگی حاصل ہو جو کبھی منقطع نہ ہو سکے۔

۶۶۔۔۔ بخاری کی ایک روایت میں والیوم الآخر کے بجائے والبعث الآخر کا لفظ ہے۔ ’بعث‘ کے بعد ’آخر‘ کا لفظ صرف تاکید کیلئے ہے۔ اسلئے کہ ’بعث‘ یعنی مرنے کے بعد اٹھنا تو آخر ہی میں ہوگا۔۔۔۔۔ یا یہ بتانا مقصود ہو کہ بعث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بعث اول اور دوسرا بعث آخر۔

عدم سے وجود کی طرف یا شکم مادر سے دنیا میں آنا یہ بعث اول ہے۔ اولیٰٰن قبر سے محل حشر و نشر کی طرف اٹھنا یہ بعث ثانی ہے۔ اور یہی بعث ثانی ہے جس پر ایمان ضروریات دین سے ہے۔ بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں۔ ’ہلقاہہ اور تلوٰمن بالبعث‘ آیا ہے۔ یعنی لقاء اور بعث کی تصدیق بھی ایمانیات سے ہے۔ لقاء سے کیا مراد ہے۔۔۔۔۔ اس سلسلہ میں مختلف اقوال ملتے ہیں:

(۱) دار جزاء کی طرف منتقل ہونا۔

(۲) حساب۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی رویت۔

یہ تیسرا قول رائج و ارجح ہے اور لفظ لقاء کے لغوی معنی کے زیادہ مناسب ہے۔ لقاء کی یہ تیسری توضیح کی روشنی میں یہ یقین، کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار حق ہے اور آخرت میں صالحین کو دیدار الہی ہوگا ایمانیات میں داخل ہے۔

بخاری کی اس دوسری روایت میں بعث سے کیا مراد ہے اس میں بھی دو قول ہیں:

(۱)۔۔۔ مَرَدُوں کا اپنی قبروں سے اٹھنا اور اس کے بعد کے مرحلے۔۔۔۔۔ مثلاً۔۔۔۔۔

حساب، میزان، جنت و جہنم۔۔۔ ان چاروں امور کی ایک روایت میں تصریح بھی ہے۔

(۲)۔۔۔ بعث سے مراد بعث انبیاء ہے۔

۶۷۔۔۔ وَتُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ: مسئلہ قدر ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جسکے سمجھنے میں اکثر اذہان و افکار حیران و سرگرداں رہے۔ کتنے قدم ہیں جو لغزش کھا گئے اور ذہن ہیں جو اسکے بحر معانی میں غوطہ زن ہوئے مگر ساحل مراد تک نہ پہنچ سکے۔ ہر دور میں اس پر غور کرنے والے غور کرتے رہے۔ فضل الہی جن کے شامل حال تھا، وہ تو کسی ناکسی قدر اطمینان بخش منزل تک پہنچ گئے لیکن ان کے سوا بے شمار اہل فکر شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنس کر رہ گئے اور نہ نکل سکے۔

اسی لئے ایمان بالقدر کے بیان کرنے میں کافی اہتمام برتا گیا ہے اور لفظ 'تؤمن' کو دہرا کر اس کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ کے بعد مَحْضًا وَالْقَدَرِ خَيْرٌ وَشَرٌّ کہنا کافی تھا۔

ممکن ہے کہ لفظ 'تؤمن' کے اعادہ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ ایمان بالقدر کی نوعیت اور ہے اور ان امور پر ایمان کی نوعیت اور ہے، جن کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔۔۔۔۔ اسلئے۔۔۔۔۔ جو امور ایمان بالقدر سے پہلے مذکور ہو چکے ہیں ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کفر ہے بخلاف مسئلہ قدر کے۔ اسلئے قدر کا منکر دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا لیکن دائرہ اہلسنت و جماعت سے ضرور باہر ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ المختصر۔۔۔۔۔ اللہ، ملائکہ، کتب الہیہ، انبیاء کرام اور قیامت کے دن پر ایمان ضروریات دین سے ہے اور قدر پر ایمان ضروریات اہلسنت سے۔ تو جو ضروریات دین میں سے کسی کا انکار کرے وہ کافر ہے اور جو ضروریات اہلسنت میں سے کسی کا انکار کرے تو وہ ضال مضل ہے۔۔۔۔۔ الحاصل۔۔۔۔۔ ایمان بالقدر کے بغیر کوئی مؤمن کامل نہیں ہو سکتا۔

۶۸۔۔۔۔۔ وَخَيْرٌ وَشَرٌّ: خیر و شر سے مراد نفع و ضرر ہیں۔۔۔۔۔ ایک روایت میں

اس پر 'وَحُلُوهُ وَمَرُّهُ' (اس کی مٹھاس اور کڑواہٹ) کا بھی اضافہ ہے۔ ایمان بالقدر کا معنی کیا ہے، اسکی تشریح جواہر پارے کے تحت گزر چکی اور مزید تحقیق و تفصیل اپنے موقع پر انشاء اللہ تعالیٰ آئے گی۔۔۔۔۔ اس مقام پر صرف اتنا اور سمجھ لیجئے کہ چونکہ ایمان بالقدر، ایمان بالتقضاء کو مستلزم ہے اسلئے حدیث میں صرف ایمان بالقدر کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

۶۹۔۔۔۔۔ قَالَ صَلَّيْتُ قَالَ فَانْخَبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ۔۔۔۔۔ کیا قول کے مطابق

یہاں احسان سے مراد وہی ہے جو ان آیات کریمہ میں احسان سے مراد ہے۔

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰی ﴿سورۃ البقرہ: ۲۶﴾

ان کیلئے جنہوں نے بھلائی کی ہے، بھلائی ہے۔

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ﴿سورۃ الرمن: ۶۰﴾

کیا ہے احسان کا بدلہ جزا احسان کے۔

أَحْسِنُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿سورۃ البقرہ: ۱۹۵﴾

احسان کرو! بیشک اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اور ظاہر یہ ہے کہ ان آیات مذکورہ میں احسان سے وہ معنی مراد ہے جو اسلام و ایمان اور ان کے سوا۔۔۔۔۔ مثلاً۔۔۔۔۔ اعمال و اخلاق و احوال پر مشتمل ہو۔ اور حدیث میں وہ معنی مراد ہے جو اتنی عمومیت نہیں رکھتا بلکہ اس سے خاص ہے۔ اس معنی خاص کی تعیین میں دو قول ملتے ہیں:

(۱)۔۔۔۔۔ احسان سے مراد ہے اخلاص، کیونکہ اسلام و ایمان کی صحت میں اخلاص شرط ہے، یعنی بغیر اخلاص کے کسی کا ایمان صحیح نہیں۔ تو جو اطاعت میں مخلص ہے وہ اپنی طاعت کا فائدہ اپنے کو پہنچائے گا اور جو ریا کار ہے وہ خود ہی اپنے عمل کو بے کار کر رہا ہے۔۔۔۔۔ اپنے عمل کو، عوض، غرض، حرص، اور ریا، سے پاک و صاف کر لینے کا نام اخلاص ہے۔

(۲)۔۔۔۔۔ احسان سے۔۔۔۔۔ احسان عمل۔۔۔۔۔ یعنی عمل کے احکام اور اس کا اتقان مراد ہے۔۔۔۔۔ اتقان کسی امر کو مضبوطی اور دھمکی کے ساتھ کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ معنی اخلاص، حضور، خشوع سب کو شامل ہے۔

۷۰۔۔۔۔۔ قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ۔۔۔۔۔ یعنی تو اللہ کو ایک جانے اور اس کے اوامر و نواہی میں اسکی اطاعت کرے۔ ایک روایت میں ہے تخشی اللہ یعنی تو اللہ سے ڈرے۔ ان دونوں روایتوں کا حاصل ایک ہے۔ اسلئے کہ عبادت خشیت کا ثمرہ ہے اور خشیت عبادت کا سبب۔۔۔۔۔ کمال فروتنی کے ساتھ اطاعت عبادت ہے۔ عبادت وہ فعل اختیاری ہے جس سے شریعت کی اتباع اور اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب مقصود ہو۔۔۔۔۔ امام راغب نے "الْعِبَادَةُ فِعْلٌ اخْتِيَارِيٌّ" فرما کر یہ واضح کر دیا کہ عبادت فعل اختیاری ہے۔ لہذا موجودہ دور کے بعض مطلق العنانی اہل قلم

’جنہوں نے غیر اختیاری افعال پر بھی عبادت کا اطلاق کیا ہے اپنی روش میں پھٹکے ہوئے ہیں۔ بعض محققین کا ارشاد ہے کہ مخلوقات کی تخلیق و ابداع اور رسولوں کے ارسال کا منہائے مقصود عبادت ہی ہے۔ بندہ جس قدر از روئے معرفت کامل ہوگا اسی قدر عبادت گزار ہوگا۔ اور اسکی عبودیت اسی قدر کامل اور رفیع المنزلت ہوگی۔

خدا کے حضور انتہائی فروتنی کے تین مرتبے ہیں:

☆ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ عابد عذاب کے خوف سے اور ثواب کی خواہش میں خدا کی پرستش کرے، اس کو عبادت کہیں گے۔ اور یہ علم الیقین والے کی منزل ہے۔

☆ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ عابد کسی غرض کے بغیر اپنے اس والہانہ شوق سے جو اس میں عبادت اور تکالیف شرعیہ کو قبول کرنے کیلئے موجود ہے، اللہ کو پوجے۔ اب اس کو صرف عبادت ہی نہیں بلکہ عبودیت بھی کہیں گے اور یہ عین الیقین والے کی منزل ہے۔

☆ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ عابد محض اس خیال سے خدا کو پوجے کہ وہ اللہ ہے اور میں عبد ہوں، اور اسکی الہیت ہی چاہتی ہے کہ اسکو پوجا جائے اور میری عبودیت کا تقاضہ ہے کہ میں پوجوں۔ اب اسکو عبادت و عبودیت ہی نہ کہیں گے بلکہ عبودہ بھی کہیں گے اور یہ حق الیقین والے کی منزل ہے۔

۱۔۔۔۔۔ اس مقام پر فیوض الباری فی شرح صحیح البخاری کا یہ اقتباس بہت ہی فائدہ بخش ہے۔۔۔۔۔ عبادت کے معنی انتہائے تذلل اور غایت خضوع کے ہیں۔ یعنی انسان اپنے آپ کو کسی کے سامنے ذلت و پستی کے اس آخری درجے میں سمجھے کہ جس کے بعد عاجزی اور ذلت کا کوئی درجہ ہی نہ ہو۔ اس قسم کی عاجزی کرنے والا عابد ہے۔ اور ایسی عاجزی عبادت ہے۔ عبادت کا تعلق نہ تو مافوق الاسباب امور سے ہے اور نہ غائبانہ انداز سے، بلکہ اس کا تعلق محض اعتقاد سے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی عاجزی اور ایسی ذلت و پستی کا اظہار اس ہستی کیلئے کیا جاسکتا ہے جس کے متعلق صفات مستقلہ کا اعتقاد رکھا جائے، یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی ہیں۔۔۔۔۔ (خود بخود) اس میں موجود ہیں کسی نے اس کو کوئی صفت دی نہیں اور یہ صفات ذاتیہ استحقاق عبادت کا مناسط و مدار ہیں۔ ان صفات ذاتیہ کا کسی میں ثابت کرنا استحقاق عبادت والوہیت کا ثابت کرنا ہے۔ اور جو صفت استحقاق عبادت کا مناسط ہے، خواہ وہ علم ہو یا قدرت، تصرف ہو یا خالقیت، ان کا ذاتی اور

مستقل ہونا ضروری ہے۔ ورنہ افراد ممکنات کا مستحق عبادت ہونا لازم آئے گا۔ کیونکہ عطائی غیر مستقل حادثہ، صفات افراد مخلوقات میں پائی جاتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ استحقاق عبادت کیلئے صفات مستقلہ لازم ہیں اور صفات مستقلہ کیلئے استحقاق عبادت لازم ہے۔ کسی کو مستحق عبادت کہنا اس کیلئے استقلال ذاتی کو ثابت کرنا ہے اور کسی کو مستقل بالذات ماننا مستحق عبادت قرار دینا ہے۔

یہیں سے عبادت و تعظیم میں فرق معلوم ہو گیا۔ عبادت میں تعظیم بھی ہوتی ہے اور جس کی تعظیم کی جائے اس کی الوہیت اس کے واجب الوجود اور مستحق عبادت ہونے کا اعتقاد بھی ہوتا ہے اور تعظیم میں یہ اعتقاد نہیں ہوتا۔ یعنی ہر عبادت تعظیم ہے، مگر ہر تعظیم عبادت نہیں ہے۔ لہذا غیر اللہ کی عبادت شرک ہے، تعظیم شرک نہیں، بلکہ جائز، بلکہ بعض کی تعظیم فرض عین ہے۔۔۔ مثلاً۔۔۔ قرآن پاک کی، انبیاء علیہم السلام و ملائکہ کی تعظیم و توقیر، اور بعض کی تعظیم واجب ہے۔۔۔ مثلاً۔۔۔ والدین کی۔ بعض لوگ تعظیم و عبادت میں فرق نہیں کرتے۔ یا ان کے مفاہیم سے جا مل ہیں۔ جہاں وہ غیر اللہ کی تعظیم ہوتی دیکھتے ہیں جھٹ شرک کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات بدیہی ہے کہ تعظیم کی وہی صورت شرک قرار دیا جائے گی جس میں معظم کی الوہیت کا اعتقاد ہو۔ اسکے علاوہ تعظیم کی جتنی بھی صورتیں اور شکلیں ہیں ان میں سے بعض ناجائز و حرام تو ہو سکتی ہیں، مگر شرک و کفر ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتیں۔۔۔ مثلاً۔۔۔ قبر کو سجدہ کرنا۔ اور مقبور کی الوہیت اور واجب الوجود ہونے کا عقیدہ رکھ کر اور اس کیلئے صفات مستقلہ مان کر سجدہ کرنا شرک ہے۔ لیکن اگر یہ اعتقاد نہ ہو اور محض مقبور کی تعظیم جو معظم کی الوہیت اور واجب الوجود ہونے کے اعتقاد کے ساتھ نہ کی جائے۔ اس میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس تعظیم کی کچھ صورتیں ناجائز و حرام ہوگی، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ مذکورہ بالا اعتقاد کے ساتھ جو تعظیم کی جائے وہ شرک قرار پائے۔

اس مقام پر یہ بھی خیال رہے کہ تعظیم کے کسی خاص طریقے کو حرام و ناجائز صرف اپنی عقل اور اپنے قیاس سے نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس کیلئے شرعی نصوص کی ضرورت ہے۔ بغیر شرعی ثبوت کے جو لوگ خواہ مخواہ کیلئے ہر بات کو ناجائز کہنے کے عادی ہیں ان کو اچھی طرح سوچ لینا چاہئے کہ ان کی یہ حرکت اللہ و رسول پر کھلا ہوا افتراء ہے۔



۷۲۔۔۔۔۔ اسی واقعہ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَمَا تَرَاہُ۔۔۔۔۔ احسان یہ ہے کہ تم ہر کام اللہ کیلئے اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

اس روایت نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ احسان کا تعلق صرف نماز ہی سے نہیں بلکہ جملہ اعمال خیر سے ہے، اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر عبادت و بندگی اور اس کے ہر حکم کی اطاعت و فرمانبرداری اس طرح کی جائے اور اسکے مواخذہ سے اس طرح ڈرا جائے کہ گویا وہ ہمارے سامنے ہے اور ہماری ہر حرکت و سکون کو دیکھ رہا ہے یہی احسان ہے۔

۷۳۔۔۔۔۔ كَمَا تَرَاہُ یعنی:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ عِبَادَةً مُّشَبَّهَةً بِعِبَادَتِكَ حِيْنَ تَرَاہُ۔  
تو عبادت کرے اللہ کی ایسی عبادت جو تیری  
خدا کے دیکھنے کے وقت کی عبادت کے مشابہ ہو۔

۔۔۔۔۔ اور اگر پوری عبادت کی اصلی صورت یہ ہے کہ:

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ حَالًا تُحَوِّنُكَ مُّشَبَّهًا بِمَنْ يَنْظُرُ اِلَى اللّٰهِ خَوْفًا مِّنْهُ  
وَحَيَاةً وَخُضُوعًا وَخَشُوعًا وَاَذْبَابًا وَصِفَاءً وَوَفَاءً

۔۔۔۔۔ تو ترجمہ یہ ہوگا۔۔۔۔۔

’تو عبادت کرے اللہ کی اس حال میں کہ تو مشابہ ہو۔

خوف الہی، حیاء، خضوع، خشوع، صفا اور وفا میں اس شخص کے جو اللہ کو دیکھ رہا ہو۔

۔۔۔۔۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب عامل اس کو دیکھ رہا ہو جس کیلئے عمل کر رہا ہو تو یقیناً وہ اپنے عمل کو حسین سے حسین تر بنانے کی پوری امکانی کوشش کرے گا۔۔۔۔۔ اور اگر ایسی صورت نہ ہو کہ عامل اس کو دیکھے جس کیلئے وہ عمل کر رہا ہے۔۔۔۔۔ مگر یہ خیال اس کو رہے کہ ہم تو اس کو نہیں دیکھ رہے ہیں مگر وہ ہم کو دیکھ رہا ہے، جب بھی وہ عمل کو حسین بنانے کی پوری جدوجہد کریگا۔ اسی لئے ارشاد ہو رہا ہے:

(فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاہُ) اِی تعاملہ معاملۃ من تراه  
(فَاِنَّہُ یَرَاکَ) اِی تعاملہ معاملۃ من یراک

۔۔۔۔۔ یعنی اگر تم اپنے عمل میں وہ صورت حال نہیں پیدا کر سکتے جو اس کی صورت حال اور اسکے معاملہ کی طرح ہو جس کو تو دیکھتا ہو تو ویسا معاملہ کر جو اسکے معاملے کی طرح ہو جو تجھے دیکھتا ہو۔ یہ تصور کہ ہم جس کیلئے عمل کر رہے ہیں اس کو ہم دیکھ رہے ہیں، عمل میں اخلاص و تحسین اسی لئے پیدا کرتا ہے کہ

ہم سمجھ لیتے ہیں کہ جب ہم اسکے روبرو ہیں تو وہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔۔۔۔۔ بالفرض۔۔۔۔۔ اگر ہم کو یہ یقین ہو جائے کہ ہم تو اسکے سامنے ہیں مگر وہ کسی وجہ سے ہم کو نہیں دیکھ رہا ہے تو ہمارے عمل میں وہ اخلاص نہیں ہو سکتا جو احساسِ رویت کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور جب خیالِ رویت ہی اخلاص فی العمل کا موجب ہے تو پھر حضور و عدم حضور میں سے کسی کو بھی احسان فی العمل میں کوئی دخل نہیں رہا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ تصورِ رویت کے ساتھ ساتھ خیالِ حضور و مشاہدہ کی صورت میں عابد چند ایسی خصوصیات کے ساتھ ضرور مخصوص ہو جاتا ہے جو عدمِ مشاہدہ اور عدم حضور کی صورت میں حاصل نہیں ہوتیں۔۔۔۔۔ مگر یہ خصوصیتیں نفسِ حقیقت احسان پر زائد ہیں۔۔۔۔۔ بایں ہمہ۔۔۔۔۔ ان کا حصول احسان کا مرہون منت ہے۔۔۔۔۔ گویا۔۔۔۔۔ احسان و اخلاص عابد کے اس مقام بلند کے نیچے کی ایسی منزل ہے جس پر سے گزرے بغیر اس مقام تک نہیں پہنچا جا سکتا۔۔۔۔۔ حضرت شیخ متحق نے احسان کی دو صورتیں حدیث پاک سے نکالی ہیں۔ بلطف دیگر احسان کے دو درجوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔۔۔۔۔ میرا فہم ناقص عرض کرتا ہے کہ اگر تَعَالٰکَ تَرَاہُ اور فَائِدَہٗ نَدَاکَ سے عبادت کے دو درجوں کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو زیادہ مناسب ہے، اسلئے کہ مفہوم عبادت میں اس قدر وسعت اور پھیلاؤ ہے جو احسان والے عمل پر بھی صادق آتا ہے اور اس عمل پر بھی جو اس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

بعض عرفاء فرماتے ہیں کہ حدیث کے اس زیر بحث ٹکڑے میں عبادت کے دودرجوں کی طرف اشارہ کیا ہے: ایک وہ عبادت جو تجلیات الہیہ اور انوار صمدیہ کے مشاہدہ کے ساتھ ہو اور یہ ہے کائناتِ ترانہ والی عبادت۔ اور دوسری وہ عبادت جس میں نفس احسان کی توپوری جلوہ گری ہو مگر مذکور بالا برکات الہیہ کا مشاہدہ نہ ہو اور یہ ہے فَإِنَّهُ لَمَّا كَانَ والی عبادت۔ پہلی عبادت عرفاء کا ملین کی ہے اور دوسری عبادت دوسرے درجے کے عارفوں کی۔

۳۔۔۔ خَلِّیْ لَمْ تَحْنِ نَزَاةً فَاِنَّكَ تَرَكَ : اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ قَاتِلُہم  
تَحْنِ نَزَاةً فَاَحْسِنِ فِیْ هٰذَا لَکَ فَاِنَّكَ تَرَكَ تو اگرچہ تم اس کو دیکھتے نہیں پھر بھی تم اپنے عمل میں  
اخلاص و احسان پیدا کرو کیونکہ وہ تمہیں دیکھتا ہے۔

ایک روایت میں ہے **فَإِنْ لَمْ تَرَاهُ** یعنی اگر تم اس مشاہدہ سے غافل ہو جو غایت کمال

کے حصول کا سبب ہے تو کم سے کم درجہ میں اس سے تو غافل نہ رہو جس سے اصلی کمال حاصل ہو جائے۔ اسلئے کہ جو چیز بالکل یہ نہ حاصل ہو سکے اس کو بالکل یہ چھوڑ دینا بھی نہ چاہئے۔ تو تم عبادت میں احسان و اخلاص پر جہاں تک ممکن ہو بٹنگی برتو۔ اسلئے کہ خدائے تعالیٰ تم کو دیکھ رہا ہے، اور دیکھتا ہی رہے گا تو اس چیز کو دماغ میں حاضر رکھو تا کہ اللہ کی طرف توجہ سے غفلت میں تمہیں شرم آئے اور اس کی طاعت میں اخلاص و احسان کی کمی نہ کرو۔

۔۔۔ الخضر۔۔۔ اگر تم اللہ کو رویت معنویہ کی طرح نہیں دیکھ پا رہے ہو تو اس سے غافل نہ ہو جاؤ اسلئے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

۷۵۔۔۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ تَحَاَنُكَ ذَرَاهُ اس بات پر دلیل ہے کہ دنیا میں دیدار الہی ممکن نہیں۔ جیسا کہ مسلم شریف میں ہے:

وَاعْلَمُوا أَنَّهُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّهُمْ حَتَّى تَمُوتُوا

جان لو کہ تم اس دنیا میں اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے یہاں تک کہ تمہیں موت آجائے امام مالک علیہ السلام فرماتے ہیں کہ بصر دنیا میں، عالم فانی میں جانہ والی مخلوق ہے۔ تو جو فانی ہو وہ باقی کی رویت پر کسی طرح قادر ہو۔ رہ گیا آخرت کا معاملہ تو وہ اس کے برعکس ہے اسلئے کہ آخرت میں قوتِ باصرہ کو بقائے ابدی کیلئے پیدا کیا جائے گا۔ تو باقی سبحانہ تعالیٰ پر نظر کرنے کی اسے قدرت مل جائے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے سر کی آنکھوں سے معراج کی رات رب تعالیٰ کا کیسے مشاہدہ فرمالیا۔ اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا گیا۔

۱۔۔۔ نبی کریم ﷺ کی رویت پر کسی اور کی رویت اور نبی کی ذات پر کسی اور کی ذات کو قیاس کرنا صحیح نہیں۔۔۔ الخضر۔۔۔ نبی کی ذات مستثنیٰ ہے۔

۲۔۔۔ نبی کریم نے رب کا مشاہدہ ملکوتِ اعلیٰ میں کیا۔ وہاں کے احوال کو اس دنیا کے احوال پر قیاس نہ کرنا چاہئے۔

۷۶۔۔۔ اکثر روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت جبریل نے اس سوال کے جواب کو سن کر صدقت فرمایا۔

صحیح مسلم کی بعض روایت اور شرح السنہ میں بھی اس جواب کے بعد صدقت مذکور و

مسطور ہے۔ اب اگر بعض روایتوں میں یہ لفظ مذکور و مسطور نہ ملے تو اسکی تین وجہیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔۔۔۔۔ راوی روایت کرنا فراموش کر گیا ہو۔

۲۔۔۔۔۔ راوی نے اختصار کے پیش نظر اس کو نہ ذکر کیا ہو۔

۳۔۔۔۔۔ راوی نے اسلئے اسکی روایت ضروری نہ سمجھی ہو کہ اس سے پہلے اسکا ذکر کئی بار آ ہی چکا ہے۔ اس پر قیاس کر کے لوگ خود ہی سمجھ لینگے کہ یہاں بھی لفظ صدقت استعمال کیا گیا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ حقیقت حال یہ ہے کہ خود حضرت جبرئیل ہی نے اس مقام پر اس لفظ کو نہیں دہرایا۔ اسلئے کہ احسان نام ہے اخلاص کا۔ اور اخلاص ایک سرالہی ہے جس کی خبر نہ ملک مقرب کو دی گئی اور نہ نبی مرسل کو۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں آیا ہے:

اَلْاَخْلَاصُ سِرٌّ مِنْ اَسْرَارِىْ اَوْزَعَتْهُ عَلٰى قَلْبٍ مَنْ اَخْبَيْتَ مِنْ عِبَادِىْ

اخلاص میرے اسرار میں سے ایک سر ہے جسکی حقیقت کا

انکشاف میں نے اسی کے قلب پر کیا ہے جسے میں نے محبوب بنالیا ہے

۴۔۔۔۔۔ ہاں ہمہ۔۔۔۔۔ صدقت کے مذکور نہ ہونے کی پہلے جو وجہ ہے وہی اوٹی ہے اور

زیادہ قرین قیاس ہے۔

۵۔۔۔۔۔ قَالَ فَاخْبِرْنِىْ عَنِ السَّاعَةِ: یعنی قیامت کے قیام کے وقت کی خبر دیجئے

۔۔۔۔۔ الغرض۔۔۔۔۔ سوال کا یہ منشاء نہیں کہ قیامت کے وجود کی خبر دیجئے۔ اسلئے کہ قیامت کا وجود

ثابت شدہ یقینی امر ہے۔

ایک روایت میں تو صاف صاف مَتٰى السَّاعَةُ کا لفظ آیا ہے جسکا معنی یہی ہے کہ

قیامت کب آئے گی۔ ویسے بھی الیوم الآخر کا پہلے ذکر ہو چکا ہے جس سے قیامت کے وجود کا علم

تو ہو ہی چکا تھا لہذا اب قیامت کے قیام کے وقت ہی سے سوال متعلق ہو سکتا ہے۔ از روئے عرف

رات و دن کے ~~حوالہ~~ کے چوبیسویں حصے کا نام ساعت ہے۔ جس کو ہم گھنٹہ کہتے ہیں۔ ساعت کا

اطلاق جس طرح قیامت پر ہوتا ہے اسی طرح ایک عہد کے افراد کی موت پر بھی ہوتا ہے۔ اور یوں

ہی ایک فرد کی موت پر بھی ہوتا ہے۔ ہاں قیامت کو ساعت کہہ کر نہیں گے۔ ایک پورے عہد کے

افراد کی موت کو ساعت وسطی کہیں گے اور ایک فرد کی موت کو ساعت صغری کہیں گے۔

۷۸۔۔۔۔۔ سَأَلْتُ عَنْهَا مَا عَلَّمَ مِنَ السَّائِلِ: یعنی اے جبرئیل اس مسئلے میں میرا

اور تمہارا علم برابر ہے۔ کہ مجھ کو بھی خبر ہے اور تم کو بھی، اس مجمع میں یہ پوچھ کر راز ظاہر کرانا مناسب نہیں۔ معلوم ہوا کہ اس میں حضور ﷺ نے اپنے جاننے کی نفی نہیں کی بلکہ اعلیت یعنی زیادتی علم کی نفی کی ہے۔ اگر اپنے علم کی نفی مقصود ہوتی تو اتنی دراز عبارت کی ضرورت نہ محسوس ہوتی۔ صرف لا اعلم (میں نہیں جانتا) کہہ دینا کافی تھا۔ یہ جواب سن کر حضرت جبریل نے عرض کیا تو قیامت کی نشانیاں ہی بتا دیجئے۔ اس پر حضور ﷺ نے چند نشانیاں بیان فرمائیں۔

غور فرمائیے جن کو قیامت کا بالکل علم ہی نہ ہو ان سے اسکی نشانیاں پوچھنا کیا معنی؟ نشان اور پتہ تو جاننے والے سے پوچھا جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے قیامت قائم ہونے کا دن بتایا۔

مشکوٰۃ، باب الجمعہ میں ہے:

لَآتِقُومُ السَّاعَةِ إِلَّا فِي يَوْمِ الْجُمُعَةِ

قیامت جمعہ کے دن ہی قائم ہوگی۔

--- کلمہ اور بیچ کی انگلی ملا کر فرمایا: بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ۔

ہم اور قیامت اس طرح ملے ملے بھیجے گئے ہیں

(باب خطبہ یوم الجمعہ)

--- یعنی ہمارے زمانے کے بعد بس قیامت ہی ہے اور اس قدر علامات قیامت ارشاد فرمائیں کہ ایک بات بھی نہ چھوڑی۔ ان علامات نے قیامت کو بالکل ظاہر فرمادیا۔ پھر قیامت کا علم نہ ہونے کے کیا معنی؟

بس زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سنہ نہ بتایا کہ فلاں سنہ میں قیامت ہوگی۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ قیامت کو اچانک آتا ہے جیسا کہ خود قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے۔ اور سنہ بتا دینے کی صورت میں قیامت کا آنا اچانک نہ ہوتا اور۔۔۔۔۔ بالفرض۔۔۔۔۔ اگر قیامت کو اچانک آنا نہ ہوتا، جب بھی سرکارِ دو عالم سن کی نشاندہی کیسے فرماتے۔ اسلئے کہ سرکار کے عہد میں سنہ کا تقرر ہی نہ ہوا تھا۔ سنہ ہجری کا عہد فاروقی میں تقرر ہوا۔ ہجرت تو ربیع الاول میں ہوئی، مگر سنہ ہجری کا آغاز محرم سے ہوتا ہے، بلکہ اس زمانے میں قاعدہ یہ تھا کہ سال میں جو بھی کوئی واقعہ اہم ہوتا اسی سے سال کو منسوب کر دیا جاتا۔۔۔۔۔ مثلاً۔۔۔۔۔ سال فیل، سال فتح، سال حدیبیہ وغیرہ۔ تو سنہ ہجری کے



اس واقعہ کی ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت جبرئیل نے قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا تو سرکار نے اپنا سر جھکا لیا۔ اور ان کو کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر انہوں نے اسی سوال کا اعادہ کیا مگر حضور نے اس بار بھی ان کو کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔۔۔ باریاں ہر۔۔۔ حضرت جبرئیل نے پھر تیسری بار اسی سوال کو دوباراً تو آپؐ نے سراٹھا کر ارشاد فرمایا۔۔۔ مَا أَسْأَلُ عَنْهَا يَا عَلَمٌ مِنَ السَّائِلِ --- واقعہ کے اس حصے سے بھی اشارہ ہوتا ہے کہ حضور کو قیامت کا علم تھا۔ مگر اس کو ظاہر کرنا منظور نہ تھا۔ اسلئے آپؐ اس سوال کے جواب میں خاموش ہو گئے مگر جب سائل کا اصرار بددھتا ہوا دیکھا تو آپؐ نے ایک ایسا بلوغت جو اب دیا کہ جس سے آپؐ کے علم کی نفی بھی نہ ہو اور راز کی بات رازی ہی میں رہ جائے۔

اسلئے کہ اگر قیامت سے متعلق اپنے علم کی نفی کا اظہار مقصود ہوتا اور واقعہ سرکار کو علم قیامت نہ ہوتا تو حضرت جبریل کے سوال کے جواب میں نہ تو خاموشی کی ضرورت تھی اور نہ تو اس طرح کے جواب کی۔ سیدھے سیدھے انداز میں فرمادیا جاتا کہ قیامت کا علم مجھے نہیں، حضور کی خامشی سے یہ سمجھ لینے کے باوجود کہ آپ اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے حضرت جبریل نے اپنے سوال کا جواب چاہنے میں اسلئے اصرار فرمایا تا کہ یہ بات حاضرین پر واضح ہو جائے کہ قیامت کا وقت بتانا فریضہ نبوت سے نہیں۔ علم قیامت وغیرہ سے متعلق ایک محققانہ تحریر آگے آرہی ہے۔

اس مقام پر اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو جا رہا ہوں کہ اگر کسی کو اس بات پر اصرار ہے کہ۔  
 'مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ' کا مطلب یہی ہے کہ قیامت کا علم نہ رکھنے میں حضور اور  
 حضرت جبرئیل برابر ہیں یعنی اس سوال و جواب کے وقت نہ تو حضور کو قیامت کا علم تھا اور نہ ہی  
 حضرت جبرئیل کو۔ جب بھی اس حدیث کو ان کے خلاف کیسے جھٹ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے

علم و آگہی کی روشنی میں یہ دعویٰ ہے کہ:

لَمْ يَخْرُجْ نَبِيًّا مِنْ الدُّنْيَا حَتَّى أَطْلَعَهُ اللَّهُ عَلَى جَمِيعِ  
الْمُعْجَبَاتِ وَعَلَى تِلْكَ الْخُمْسِ وَمِنْ جُمْلَتِهَا السَّاعَةُ  
یعنی ہمارے نبی اس وقت تک دنیا سے تشریف نہیں لے گئے۔

یہاں تک کہ آپ کو اللہ نے تمام غیبوں اور امور خسرہ جن میں  
سے ایک قیامت بھی ہے ان سب پر مطلع فرما دیا۔

۔۔۔ حدیث کے خود اپنے ترجمہ کی روشنی میں مفسرین یہی تو کہہ سکتے ہیں کہ اس سوال و جواب  
کے وقت رسول کو قیامت کا علم نہ تھا مگر اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ تاحیات نبی کریم اس علم  
سے خالی رہے اور اللہ نے آخر وقت تک ان کو یہ علم عطا نہیں فرمایا۔

۷۹۔۔۔۔۔ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا

یعنی بعض ان علامتوں کا ذکر فرمائیے جو قرب قیامت کی نشاندہی کریں۔

ایک روایت میں ہے۔۔۔ ‘عَنْ أَشْرَاطِهَا’۔۔۔ اس کا بھی معنی یہی ہے۔

ایک روایت میں ہے۔۔۔ وَلَكِنْ إِنْ شِئْتَ بَيِّنْتُكَ عَنْ أَشْرَاطِهَا قَالَ أَجَلٌ۔۔۔

لیکن اگر تم چاہو تو میں اسکی نشانیاں بیان کر دوں، حضرت جبریل نے عرض کیا ہاں (یعنی بیان فرمائیے)  
ایک روایت میں لفظ جل کی جگہ۔۔۔ ‘فَخَدِثْنِي’۔۔۔ ہے یعنی آپ قیامت کی  
نشانیاں مجھ سے بیان فرمائیے۔

روایتوں کا یہ لفظی اختلاف راویوں کے نسیان پر یا ان کے اسلوب بیان کے اختلاف

پر مبنی ہے۔

۸۰۔۔۔۔۔ أَنْ تَلِدَ الْأُمَّةُ رَبَّتَهَا: یعنی قرب قیامت کے جملہ علامات سے یا لفظ دیگر

اسکی نشانوں میں سے ایک کنیز کا اپنے مالک مولیٰ کو جہنا ہے۔ ایک روایت میں رہتھا کی جگہ رہا  
کا لفظ ہے۔ ان دونوں کا حاصل مراد ایک ہی ہے۔ لفظ رب کا اطلاق اضافت کے بعد غیر خدا پر  
بھی کیا جاسکتا ہے، پھر بھی رہا کے بجائے رہتھا کہنا راوی کے کمال احتیاط کی نشاندہی کرتا ہے،  
جس نے اضافت کے ساتھ بھی غیر خدا پر لفظ رب کا اطلاق کچھ مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ اس سے  
بہر صورت کسی نہ کسی حد تک الفاظ جاہلیت سے مشابہت ہو جاتی ہے۔۔۔ نیز۔۔۔ لفظ رب

العباد سے کسی نہ کسی نوع کی شرکت ہو جاتی ہے۔ گو اس طرح کی مشابہت و شرکت سے اصولاً مذکورہ اطلاق کے جواز پر آنچ نہیں آتی، پھر بھی احتیاط میں کیا برائی ہے۔ فقرہ زیر بحث کی کئی ایک توجہیں شارحین کی تشریحات کی روشنی میں جواہر پارے کے تحت پیش کی جا چکی ہیں۔

۸۱۔۔۔۔۔ وَلَئِنْ تَرَىٰٓٓ۔۔۔ البع: قرب قیامت کی یہ دوسری علامت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب ایسے ویسے، کیسے کیسے نظر آئیں اور کیسے کیسے، ایسے ویسے دکھائی دیں۔ تو سمجھ لینا چاہئے کہ قیامت قریب ہے۔ قیامت کی پہلی نشانی سے یہ اشارہ ملا کہ قرب قیامت کا دور ایسا دور ہوگا جس میں ظلم، فسق اور جہل کی کثرت اپنی انتہا کو پہنچ جائے گی۔ اور دوسری نشانی سے یہ اشارہ ملا کہ اس دور میں دنیا کی محبت اور آخرت فراموشی اپنے عروج پر ہوگی۔ ان دونوں نشانیوں کا حاصل مدعا یہ ہوا کہ جب دنیا کے نظام میں ایسا انقلاب آجائے کہ معزز ازرباب عقل و دانش یہ کہہ پڑیں۔ کہ اب دنیا رہنے کی جگہ نہیں۔

فَلَا عِيشَ الْآخِرَةَ۔۔۔ اب تو زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے تو سمجھ لو کہ قیامت قریب ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو دنیا کی زندگی کو صرف ایک ساعت کی زندگی تصور کرتے ہیں اور شب و روز اپنے رب کی اطاعت میں مشغول نظر آتے ہیں۔

۸۲۔۔۔۔۔ اَلْمُخَفَاةُ: حافی کا جمع۔ حافی اس کو کہتے ہیں جس کے پیر میں جوتا نہ ہو۔ (العراة) عاری کی جمع۔ عاری ننگے کو کہتے ہیں۔ ننگا وہی نہیں ہے جس کے بدن پر کچھ نہ ہو بلکہ ننگا اسے بھی کہتے ہیں جس کے بدن کا وہ حصہ کھلا ہو جس کا چھپانا مناسب و بہتر تھا۔ (رعاء الشاة) رعاء راعی کی جمع ہے۔ اور الشاة، شاة کی جمع ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے الشاء اسم جنس ہو، اس کا ترجمہ ہے بکریوں کے چرانے والے۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے (رُعَاةُ الْاِبِلِ الْبُہْمُ) سیاہ اونٹوں کے چرانے والے۔ سیاہ اونٹ کا شمار عرب کے نزدیک حقیر ترین مالوں میں تھا۔ اسکے چرانے والے حقیر اور جاہل سمجھے جاتے تھے۔۔۔۔۔ الخاصل۔۔۔۔۔ مذکورہ بالا فقرہ ان کی حقارت اور جہالت کی طرف کنایہ ہے۔ اہل عرب سیاہ اونٹوں کے بجائے سرخ اونٹوں کو خیر الاموال میں شمار کرتے تھے۔

حدیث زیر بحث میں ذکر کی ہوئی دونوں نشانیوں سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ دین اسلام

کو پوری قوت نصیب ہو چکی ہوگی اور مسلمان غلبہ و استیلاء کی انتہا کی امکانی منزل پر پہنچ چکا ہوگا۔ اسکے اقبال کا آفتاب نصف النہار پر جگمگا رہا ہوگا۔

مگر اسے قیامت کی نشانی کس طرح قرار دیا جائے گا؟ اسے قیامت کی نشانی قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے انتہائی عروج پر پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ یہی دستور فطرت ہے۔ جیسی تو مثل مشہور ہے ہر کمالے را زوال است۔

----- الخضر ----- غایت تک پہنچنا تراجم اور انحطاط کی نشانی ہے اور تراجم و انحطاط قرب قیامت کی علامت ہے۔

۸۳۔۔۔۔۔ (قال) کہا حضرت عمرؓ نے (ثم انطلق)

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے (ثُمَّ أَدْبَرَ) پھر رخصت ہو گئے۔ حضرت جبریلؑ (فَلَبِثْتُ) حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں ٹھہرا رہا۔ ایک روایت میں ہے (فَلَبِثْتُ) یعنی سرکار ٹھہرے رہے۔ یعنی خاموش رہے۔

(مَلَبْتُ) تھوڑی دیر۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ کافی دیر۔۔۔۔۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا (فَلَبِثْتُ ثَلَاثًا) پس تین دن تک میں ٹھہرا رہا۔ یعنی سرکار سے اس آنے والے کے بارے میں کچھ نہیں دریافت کیا۔

ترمذی کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

فَلَقَّيْنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ثَلَاثَ

یعنی اس واقعہ کے تین دن بعد نبی ﷺ نے مجھے شرف ملاقات بخشا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

فَلَقَّيْنِي لِبَالِي فَلَقَّيْنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ ثَلَاثَ

تو میں چندرات ٹھہرا رہا تو تین دن بعد مجھے نبی ﷺ نے شرف ملاقات بخشا۔

بعض روایت میں (بَعْدَ ثَلَاثَ) کی جگہ (بَعْدَ ثَلَاثَةِ) ہے اور ایک روایت میں صاف لفظوں میں (بَعْدَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ) ہے یعنی تین دن کے بعد۔ ان روایات کی روشنی میں (مَلَبْتُ) کا معنی ساعت طویل ہی کرنا مناسب رہا ہے۔ اب پوری گفتگو کا حاصل یہ ہوگا کہ میں (حضرت عمرؓ) حضور ﷺ سے اس آنے والے کے بارے میں ازراہ ہیبت رسالت و رعب نبوت یا ازراہ تعظیم و

تو قیر کچھ پوچھ نہ سکا۔

شرح مسلم شریف میں ہے کہ مذکورہ بالا روایات اور انکے متعلق یہ تاویل ومعنی آفرینی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے بالکل خلاف ہے، جس میں یہ صاف مذکور ہے کہ سرکار نے اسی مجلس میں سب کچھ ارشاد فرما دیا۔ اور بتا دیا کہ یہ آنے والے کون تھے۔ تمام روایتوں کے درمیان توفیق کی ایک صورت نکلتی ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت جبرئیل کی واپسی کے بعد تمام مجلس تو برخواست نہ ہوئی ہو، لیکن حضرت عمر کسی ضرورت سے اس مجلس سے چلے گئے ہوں، تو حضور نے اس مجلس میں اذلاً صحابہ کو خبر دی پھر تین دن کے بعد حضرت عمر کو شرفِ ملاقات عطا فرما کر ان کو بھی باخبر کر دیا۔

سب سے زیادہ مناسب بات تو یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو صراحت بتائے کہ سرکار نے اسی مجلس میں حضرت جبرئیل کی خبر دی تھی۔ تو ہو سکتا ہے کہ حضور نے بھی صحابہ کو حضرت عمر کی روایت کے الفاظ کے مطابق تین دن کے بعد خبر دی ہو۔

۸۳۔۔۔۔۔ ثُمَّ قَالَ لِي يَا غَمْرُ أَنْتَ رِي يِهَاهَا دِرَايْت سَے مراد ’علم‘ ہے۔ اسلئے کہ درایت انکل اور قیاس سے جاننے کو کہتے ہیں اور ’علم‘ یقینی طور پر جاننے کا نام ہے۔

۸۵۔۔۔۔۔ مِنَ السَّائِلُ قُلْتُ اللَّهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمَ جب حضور نے حضرت عمر سے پوچھا، اے عمر! کیا تم جانتے ہو کہ یہ سوال کرنے والے کون تھے؟ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میں نے حضور سے عرض کیا، اللہ اور اس کا رسول زیادہ جاننے والا ہے۔ لفظ ’علم‘ کو (جو اسم تفضیل کا صیغہ ہے) ذکر کر کے اشارہ کر دیا کہ کچھ علم ان کو بھی ہے مگر زیادہ علم خدا اور رسول کو ہے۔ اسلئے کہ کسی نہ کسی قدر شرکت کے بغیر زیادتی متصور نہیں۔ تعجب اور سابقہ علامتوں نے جملہ صحابہ کو اس تردد میں ڈال دیا تھا کہ آنے والا بشر ہے یا ملک؟ تو صحابہ کو فیصلہ کن منزل تک نہیں پہنچے تھے، لیکن آنے والے سے متعلق بالکل خالی الذہن بھی نہ تھے، بس اسی قدر شرکت اسم تفضیل کے استعمال کیلئے کافی ہے۔

۔۔۔۔۔ علاوہ ازیں ۔۔۔۔۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اسم تفضیل کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے صرف اصل فعل مراد لیا جاتا ہے اور کسی شرکت کا تصور بھی نہیں ہوتا۔

۸۶۔۔۔۔۔ قَالَ فَإِنَّهُ جِبْرِئِيلُ: یعنی جب تم نے علم کو اللہ و رسول کی طرف تفویض کر دیا تو سنو! وہ جبرئیل تھے۔



ایک روایت میں ہے کہ سرکار نے فرمایا رُدُّهُ، فَأَخَذَ وَالْبُرْدُوهُ فَمَارَ أَوْشِيًا جَانِے والے کو لوٹا لاؤ۔ تو لوگ لوٹنے چلے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ بعض علماء کا ارشاد ہے کہ حضرت جبرئیل کا اصل نام عبد الجلیل ہے۔ اور کنیت ابو الفتوح ہے۔ اور نام حضرت میکائیل کا عبد الرزاق ہے اور کنیت ابو الغنائم ہے اور حضرت اسرافیل کا نام عبد الخالق ہے اور کنیت ابو المنافع ہے۔ اور حضرت عزرائیل کا نام عبد الجبار ہے اور کنیت ابو یحییٰ ہے۔ (فیض الباری، بحوالہ معنی شرح بخاری)

لفظ جبرئیل نو فعتوں کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے جن میں سے بعض یہ ہیں، جبرائیل، جبرائیل، جبریل، جبرال، جبریل وغیرہ وغیرہ۔

۸۷۔۔۔۔ حضرت جبرئیل ایک ایسے فرشتہ ہیں جو اللہ اور رسولوں کے درمیان ایک واسطہ ہیں اور رسول کے مابین اس توسط میں یہ راز ہے کہ مکالمہ متقاطعیں کے درمیان ایک مناسبت چاہتا ہے۔ اسلئے حکمت الہی کا اقتضاء یہ ہوا کہ حضرت جبرئیل کو متوسط قرار دیا جائے اسلئے کہ ان کو دو جہتیں عطا فرمائی گئیں ہیں:

ایک جہت، عالم قدرت سے متعلق کئے ہوئے ہے۔  
اور دوسری جہت عالم حکمت سے۔

۔۔۔ تو عالم قدرت والے رخ سے وہ روحانی طور پر اللہ ﷻ یا لوح محفوظ سے وحی لیتے ہیں پھر عالم حکمت والے رخ سے نبی کی بارگاہ میں حاضر ہو کر رب تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔

لہذا کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل بصورت بشر بارگاہ نبوت میں حاضر ہو جاتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نبی کریم مرتبہ ملکیت کی طرف ارتقا فرماتے ہیں اور لباس بشریت سے معرئی و مٹھی ہو جاتے ہیں تو اس ملکوتی جمال کو عالم قدرت و روحانیت سے کافی مناسبت ہو جاتی ہے تو آپ کے قلب پر وحی وارد ہوتی ہے اس لباس ملکوتیت میں اور آپ اس کو اپنی روحانیت سے اخذ فرماتے ہیں۔

وحی کی صرف دو صورتوں کی طرف فائدہ نمبر ۱ کے تحت اشارے گذر چکے ہیں۔ ان دو صورتوں کے سوا وحی کی پانچ صورتیں اور بھی ہیں جن کو امام سیبلی نے بیان فرمایا ہے۔ یہ ساری صورتیں حدیث سے مستخرج ہیں:

- ۱۔۔۔۔۔ رویائے صادقہ، سچے خواب دیکھنا۔  
 ۲۔۔۔۔۔ القافی القلب، دل میں پھونکنا، یا دل میں ڈالنا۔  
 ۳۔۔۔۔۔ فرشتے کا کسی آدمی کی صورت کے بجائے اپنی صورت میں آنا۔  
 ۴۔۔۔۔۔ وہ طریقہ مکالمہ جو حضور کو شب معراج میں پیش آیا اور اس شب اللہ نے آپ پر وحی فرمائی اور بلا واسطہ مکالمہ فرمایا۔

ترمذی کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:  
 أَتَانِي رَبِّي فِي أَحْسَنِ صُورَةٍ فَقَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلَى  
 (بخاری)

میرے رب نے بہترین صورت میں تجلی فرمائی اور کہا  
 ملا، اعلیٰ کے فرشتے کس بات میں جھگڑا کرتے ہیں۔  
 مسلم شریف میں ہے کہ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور اکرم پندرہ سال کے  
 میں مقیم رہے اور آپ کو سات برس متواتر غیب سے آوازیں آتی رہیں اور آپ روشنی دیکھتے رہے  
 لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اور اٹھ سال آپ پر وحی نازل ہوئی۔  
 ۵۔۔۔۔۔ وحی اسرائیل مسند احمد میں صحیح حدیث ہے، حضرت شععی کہتے ہیں کہ جب  
 حضور ﷺ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو اس وقت سے وحی نازل ہونا شروع ہوئی۔ ابتداء میں  
 تین سال تک حضرت اسرائیل قرآن کے علاوہ وحی لاتے رہے۔ (فیوض الباری)  
 خود قرآن کریم میں وحی کے تین اصولی طریقوں کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ارشاد  
 ربانی ہے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا ﴿سورة الشوری: ۱۰۱﴾

کسی بشر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ سے بات کرے

أَوْ مِنْ وَرَآئِهِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِلَاذُنِهِ مَا يَشَاءُ ﴿سورة الشوری: ۱۰۱﴾

لیکن وحی کے ذریعہ، یا پردے کی آڑ سے یا وہ کسی فرشتہ

کو بھیجے جو اسکے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے، بشر کو پہنچا دے۔

ترجمہ میں وحی کی تینوں اصولی صورتوں پر میں نے نمبر لگا کر ایک کو دوسرے سے ممتاز  
 کر دیا ہے۔ یہی وہ تین صورتیں ہیں جن میں سے کسی ایک صورت کے ذریعہ خدا کا پیغام بشر تک

پہنچے گا۔ دیکھا آپ نے یہ ہے قانون قدرت بشر کیلئے۔

لیکن ایک وحی کا طریقہ اور ہے اور جس کا ذکر مذکورہ بالا ان آیات میں گونہیں ہے، مگر اس کے ثبوت میں شبہ بھی نہیں ہے۔ وحی کی یہ صورت جس کی تشریح کرنے میں جا رہا ہوں وہ نہ تو بذریعہ ملک ہے اور نہ از پس پردہ، اور نہ ہی بذریعہ القاء ملک۔ یہ اس مقام کی وحی ہے جہاں ملک کا گزر نہیں۔ پھر ملک یا القاء ملک کا سوال ہی کیا۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ یہ اس مقام قرب کی وحی ہے جہاں وحی فرمانے والے نے بے حجاب ہو کر اپنے محبوب کو شرف ہم کلامی سے مشرف فرمایا یہ وحی ’منزل‘ اَدْنٰی فَقَتَلٰی فَكَجَانِ قَاتٍ قُوَسَيْنِ اَوَاذْنٰی‘ کی وحی ہے۔

ارشادِ بانی میں سچ فرمایا گیا کہ بشر کیلئے وحی کے صرف تین طریقے ہیں۔ رہ گیا یہ چوتھا طریقہ، یہ تو خیر البشر کے ساتھ مخصوص تھا۔

۸۸۔۔۔۔۔ اَلَا كُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ یہ تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے یعنی تمہاری تعلیم کے ارادے سے آئے تھے۔ اسلئے کہ درحقیقت معلم نبی کریم تھے، حضرت جبریل آنے کے وقت معلم نہ تھے صرف سبب تعلیم تھے۔ تو اس کلام میں حضرت جبریل کی طرف تعلیم کی اسناد مجازی ہے۔ اس سوال و جواب کا منشاء یہ تھا کہ صحابہ کرام کی ان کے اپنے علم پر تاکید و تثبیت ہو جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سوال و جواب کی راہ سے باتیں دلوں میں خوب جم جاتی ہیں۔

کیونکہ جو چیز طلب کے بعد حاصل ہو وہ زیادہ عزیز ہوتی ہے اس سے جو بے محنت و مشقت مل جائے۔

حضرت شیخ متقی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے اس جملہ زیر بحث میں تعلیم کی اسناد حضرت جبریل کی طرف کو حقیقی نہیں مگر اسناد حقیقی کے حکم میں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اگرچہ درحقیقت معلم حضور نبی کریم تھے، حضرت جبریل صرف سبب تعلیم تھے، مگر چونکہ درمیان کلام میں وہ صدقت صدقہ فرماتے تھے تو اس طرح کسی نہ کسی معنی میں تعلیم دینے میں انکی بھی شرکت ہو گئی۔

۸۹۔۔۔۔۔ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت جبریل نے صحابہ تک اپنی باتوں کو وبلغ علم۔

پہنچانے کیلئے نبی کا واسطہ کیوں اختیار فرمایا، جبکہ ان کیلئے یہ آسان تھا کہ وہ براہ راست صحابہ کو مخاطب بنا کر جو کچھ کہنا تھا کہتے۔

مگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار فرمایا آخر ایسا کیوں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امت محمدیہ کیلئے وہی بات قابل قبول اور واجب العمل ہے جس کے قبول کرنے یا جس پر عمل کرنے کا حکم ان کو ان کے نبی کے ذریعہ ملا ہو، جن کے نبی کی ذات کو ہٹا کر نہ تو کسی کی بات ان کیلئے قابل قبول ہے اور نہ کسی کا حکم واجب العمل۔ اور نہ ہی کسی اور کا ارشاد ان پر حجت۔ علاوہ ازیں حضرت جبرئیل خدا اور رسول کے مابین کا واسطہ ہیں۔ خدا اور اس کے عام بندوں کے درمیان کا واسطہ نہیں۔

۹۰۔۔۔۔۔ یُعَلِّمُكُم دِينَكُمْ: اس فقرہ میں دینکم ”تمہارا دین“ سے مراد صحابہ کا دین ہے، یعنی اس ارشاد میں دین کی نسبت صحابہ کی طرف کی گئی ہے۔ بخاری کی روایت میں ہے۔۔۔۔۔ جَلَّ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِينَهُمْ۔۔۔۔۔ لوگوں کو ان کا دین سکھانے آنے تھے۔ اس میں دین کی نسبت لوگوں کی طرف کی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے اس وقت لوگوں سے مراد صحابہ و کرام ہی تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس وقت اگرچہ مخاطب مخصوص تھے، مگر خطاب عام تھا، جو قیامت تک کے مؤمنین کیلئے ہے۔ قرآن کریم میں ولی دین فرما کر دین کی نسبت رسول کریم کی طرف کی گئی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے ”أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْتَغُونَ“ کیا یہ کافر خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں؟ میں دین کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ قبر میں سوال کیا جائے گا۔ مَسْأَلُكَ تَمَّارِادِیْنِ کیا ہے، اس میں دین کی نسبت ایک فرد خاص کی طرف کی گئی ہے۔

مفردات امام راعب میں دین اور ملت کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ دین اور ملت میں فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت صرف اسی نبی کی طرف ہوتی ہے جس کا وہ دین ہوتا ہے۔

چنانچہ فرمایا فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ پس دین ابراہیم کی پیروی کرو۔ وَاتَّبِعْتُ مِلَّةَ آبَائِي اور اپنے باپ دادا کے مذہب پر چلا ہوں اور اللہ تعالیٰ یا کسی افراد امت کی طرف اس کی اضافت جائز نہیں۔ بلکہ اس قوم کی طرف بحیثیت مجموعی مضاف ہوتا ہے۔ جو اس کے تابع ہوتی ہے اور

افراد امت کی طرف اسکی اضافت نہیں ہوتی اسلئے مِلَّةُ اللہ۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔ مِلَّتِی اور مِلَّةُ زید کہنا جائز نہیں۔ جیسا کہ دین اللہ و دین زید کا استعمال جائز ہے۔ اسی طرح کسی فریضہ کی نسبت بھی مِلَّةُ کی طرف نہیں کی جاتی۔

لِہٰذَا الصَّلٰوۃُ مِلَّةُ اللّٰہِ کہنا جائز نہیں، اسکے برعکس الصَّلٰوۃُ دِیْنُ اللّٰہِ کہنا صحیح ہے۔ مذکورہ بالا ان تحقیقات نے ظاہر کر دیا کہ اب اگر میں اسلام کو خدا کا دین کہوں، یا رسول کا دین کہوں، یا صحابہ کرام کا دین کہوں، یا ساری امت محمدیہ کا دین کہوں، یا اپنا دین کہوں، یہ تمام اطلاقات درست و صحیح ہیں۔ یہ اطلاقات نہ تو شرعاً ممنوع و ناجائز ہیں اور نہ زبان و بیان کے لحاظ سے نادرست۔ بلکہ ان اطلاقات کی نظیریں نصوص میں بہت ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے۔ اس تحقیق کو سامنے رکھ کر آئیے، اہل عناد کی اس روش کو بھی ملاحظہ فرماتے چلیے۔ امام احمد رضا علیہ الرحمۃ وارضوان کی آخری وصیتوں میں سے ایک وصیت یہ بھی تھی کہ حتی الامکان اتباع شریعت نہ چھوڑو۔ اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے، اس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ وصیت کے ان لفظوں کو سن کر اہل عناد خوشی سے بغلیں بجانے لگے۔ انکے خیال میں اب ان کو ایک ایسا ہتھیار مل گیا تھا جس سے امام احمد رضا کے تمام تبلیغی، اصلاحی اور تجدیدی کارناموں کو ملیا میٹ کیا جاسکتا تھا۔

۔۔۔۔۔ الغرض۔۔۔۔۔ وہ شور مچانے لگے کہ مولانا احمد رضا تو خود اپنے قول سے کسی نئے دین کے بانی تھے جیسی تو انہوں نے یہ وصیت نہیں کی کہ اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنا۔ بلکہ بلاغ مختصر یہ کہا کہ میرے دین پر مضبوطی سے قائم رہنا اس طرز استدلال سے عارض علم و دانش پر غارۂ تحقیق تو نہیں لگا، ہاں چہرہ عناد سے نقاب کشائی ہوگئی۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ قبر کے اندر ہر فرد کو یہ حق ہے کہ ’فَادِیْنُکَ‘ تمہارا دین کیا ہے، کے جواب میں ’یَدِیْنُ الْاِسْلَامِ‘ میرا دین اسلام ہے، کہہ کر اسلام کو اپنا دین بتائے۔ اور حضرت جبرئیل کو یہ حق ہے کہ اسلام کو صحابہ کا دین فرمائیں۔

مگر امام احمد رضا کو یہ حق نہیں کہ وہ اسلام کی تعبیر اپنے دین سے کریں اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ زبان و بیان کے ضابطوں نے اور شریعت کے قانون نے اس اطلاق کی اجازت دے دی ہے۔ مگر اہل عناد اجازت دینے کو تیار نہیں۔



امام احمد رضا خاں کے دور کی پر آشوبی جن کے علم میں ہے ان کو امام موصوف کی اس وصیت میں حکیمانہ آب و رنگ نظر آ رہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ امام موصوف کے دور میں بھی ایسی جماعتوں کی کمی نہ تھی جو اسلام کے نام پر اسلام کی بیخ کنی کر رہی تھیں اور جس نے اپنے خرافات اور واپیات خیالات کو اسلام کا نام دے رکھا تھا۔ کیا ایسی صورت میں امام احمد رضا کا یہ فریضہ نہ تھا کہ وہ رخصت ہوتے ہوتے اس حقیقت کو کھلے لفظوں میں سمجھا جائیں کہ رسول کا لایا ہوا اسلام وہی ہے جس پر میں ہمیشہ قائم رہا اور جس کی مکمل توضیح و تشریح میری تصنیفات میں ملتی ہیں۔

۔۔۔ الخضر۔۔۔ اسلام ہی میرا دین ہے اور میرا دین ہی اسلام ہے۔

۹۱۔۔۔ ایک روایت میں ہے: اَزَادَ اَنْ تَعْلَمُوْا اِذَا لَمْ تَمْلُؤْا۔

یعنی آنے والے کی آمد کا منشاء یہ تھا کہ تم سیکھ لو جبکہ تم نے سوال نہیں کیا مگر کم سے کم علم تو حاصل ہی کر لو۔

ایک دوسری روایت میں ہے: اَوَّلَ الَّذِيْ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ مَا كُنْتُ بِاَعْلَمَ بِهٖ مِنْ رَّجُلٍ مِّنْكُمْ وَاِنَّهٗ لَجِبْرِیْلُ۔۔۔ یعنی قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تمہاری طرح میں بھی ان کو پہچان نہ سکا اور حال یہ ہے کہ وہ جبرئیل تھے۔

ایک تیسری روایت میں ہے کہ: ثُمَّ وُلِيَ فَلَمَّا لَمْ يَوْطَرْ يَفْقَهُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰهِ هَذَا جِبْرِیْلُ اَتَاكُمْ لِيُعَلِّمَكُمْ دِيْنَكُمْ خُذُوْا مِنْهُ مَا رَغَبْتُمْ مِنْهُ وَارْتَبِعُوْا مَا رَهَبْتُمْ هَذَا وَمَا رَفَقْتُهٖ حَتّٰی وُلِيَ۔ پھر وہ پھر گئے۔ پس جب انکی واپسی کی روش نظر نہ آئی تو نبی ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ یہ تو جبرئیل تھے۔ تو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔ تو تم ان باتوں کو ذہن نشین کر لو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ آج سے پہلے وہ میرے پاس جتنی بار آئے کبھی بھی مجھ پر اپنے کو مشہور نہیں کیا اور آج کا یہ حال ہے کہ ان کے پلٹنے سے پہلے میں نے ان کو نہیں پہچانا۔

فائدہ نمبر ۱۶ کے تحت مؤخر الذکر ان دونوں روایتوں کی طرف اشارہ کر چکا ہے اور اس پر مفصل بحث بھی کی جا چکی ہے اس مقام پر چند وجوہات کی بنا پر ان روایتوں کے ناقابل قبول ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

فائدہ نمبر ۱۶ کی ساری بحثوں کو سامنے رکھ کر ان روایتوں کو منزل قبولیت تک پہنچانے کیلئے مندرجہ ذیل کوششیں کی جاسکتی ہیں۔

۱۔۔۔ ان روایتوں میں علم کی نفی نہیں، صرف توجہ کی نفی ہے اور ظاہر ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ علم تو ہوتا ہے مگر توجہ نہیں ہوتی، جس کے سبب معلوم و معروف چیز پر وہ خفا میں رہ جاتی ہے۔ اگر علم کی نفی ہوتی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت جبرئیل کے واپس ہوتے ہی آپ اگلوں را جان لیتے۔ جب حضور نے صحابہ سے فرمایا، مجھ سے کچھ پوچھو، اسی درمیان میں ایک اجنبی شخص آکر سوال عرض کرنے لگا اور آپ جواب مرحمت فرمانے لگے۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں آپ کی ساری توجہ کا سوال سننے اور جواب مرحمت فرمانے کی طرف مائل ہو جانا کچھ مستبعد نہیں کہ ایسے وقت میں اس بات کی طرف توجہ کی ضرورت ہی کیا تھی کہ سائل کون ہے۔ مگر جب وہ سوال کرنے والے پلٹے اور باہر جا کر یکا یک غائب ہو گئے تو معاصر کار کی توجہ سائل کی ذات کی طرف مائل ہو گئی۔ اور آپ نے یہ سمجھ لیا کہ یہ حضرت جبرئیل تھے۔

اسکے برعکس چونکہ صحابہ سے براہ راست سوال و جواب نہیں ہو رہا تھا لہذا ان کی توجہ ذات سائل کی طرف بھی پوری طور پر تھی کہ آخر یہ کون صاحب ہیں۔ مگر چونکہ انہیں علم نہ تھا تو وہ آخر وقت تک نہ سمجھ سکے کہ یہ آنے والے کون تھے؟

۲۔۔۔ المختصر۔۔۔ نبی کریم کا اوّل سائل کو نہ سمجھ سکتا عدم توجہ کی وجہ سے تھا۔ اور بعد میں فوراً سمجھ لینا سابقہ علم و معرفت کی بنیاد پر تھا اور صحابہ کا آخر وقت تک نہ سمجھ سکتا عدم علم و معرفت کی وجہ سے تھا۔

۳۔۔۔ ہر رسول کیلئے بعثت کے بعد یہ تو یقیناً لازمی ہے کہ جب سیدنا جبرئیل وحی جلی یا کوئی خدائی پیغام لے کر ان کی بارگاہ میں حاضر ہوں تو وہ اچھی طرح انہیں پہچان لیں اور اس معرفت میں ذرہ برابر اشتباہ نہ ہو۔ مگر یہ ہرگز ضروری نہیں کہ حضرت جبرئیل اگر وحی جلی یا کوئی اور خدائی پیغام لانے کے سوا کسی اور مصلحت و حکمت کے پیش نظر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوں اس وقت بھی رسول کی توجہ ان کی طرف ہو۔ اس صورت میں تشہم رافضیہ جبرئیل اذا اراد النزول علیہم کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ جب حضرت جبرئیل وحی جلی یا کوئی خدائی پیغام لیکر کسی رسول پر

نازل ہونے کا ارادہ کرتے ہیں، تو وہ رسول اللہ کی آمد کی خوشبو اپنی روحانی و ملکوتی توانائی سے محسوس کر لیتا ہے۔ اس مقام پر وحی جلی سے مراد اللہ کا کلام ہے۔ اللہ کے کلام کے سوا حضرت جبرئیل جو دوسرے پیغامات لے آئے، جو کتاب الہی کا جز نہیں، انکو پیغام الہی کے خانہ میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس طرح کے پیغامات کی کافی مثالیں ہیں جنکا ذکر طوالت تحریر کا باعث ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نبی کریم نے جس موقع پر حضرت جبرئیل کی ذات پر توجہ نہیں فرمائی اس موقع پر حضرت جبرئیل نہ تو وحی جلی لے کر آئے تھے اور نہ ہی کوئی خدائی پیغام لے کر، بلکہ اللہ کے اذن سے انہیں علوم و مسائل کو دہرانے کیلئے آئے تھے، جن کا علم رسول کو اور پھر رسول سے صحابہ کو اچھی طرح حاصل ہو چکا تھا۔

--- الغرض --- حضرت جبرئیل کا مقصود صرف تذکیر اور تجدید علم تھا تو پھر اگر اس ایک موقع پر اور وہ بھی صرف اسی موقع پر حضور نبی کریم کی توجہ کسی سبب سے حضرت جبرئیل کی ذات کی طرف نہ رہی تو اس سے علم رسول کہاں مجروح ہوتا ہے۔ اور دین کے امور یقینیہ کس طرح مشکوک ہو جاتے ہیں۔

--- المختصر --- اگر فائدہ نمبر ۱۶ کو اس بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو تمام روایات میں توفیق کی مناسب صورت نکل آتی ہے اور کوئی اشکال بھی نہیں رہ جاتا۔

۹۲۔۔۔۔۔ رواہ مسلم: امام بخاری نے کتاب الایمان کے سوا کتاب التفسیر اور کتاب الزکوٰۃ میں بھی اس حدیث کا ذکر فرمایا ہے۔ امام بغوی نے اپنی دونوں تالیفوں یعنی مصابیح اور شرح السنہ کا آغاز اسی مضمون کی حدیث سے کیا ہے۔

بزاز نے اپنی مسند میں بطریق انس بن مالک، ابو اعوانہ اسفرائینی نے اپنی صحیح میں بطریق جریر ابن عبد اللہ بخلی، نسائی نے اپنی سنن میں بطریق ابو ذر غفاری، امام احمد ابن حنبل نے اپنی مسند میں بطریق عبد اللہ ابن عباس، ترمذی ابن ماجہ، ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے بھی اس حدیث کو اپنے مصنف میں ذکر کیا ہے۔

علامہ قاضی عیاض نے سچ فرمایا کہ یہ حدیث تمام وظائف اور عبادات ظاہری و باطنی کو حاوی ہے۔

۹۳۔۔۔۔۔ رواہ ابوہریرہ: حضرت ابوہریرہ نے بھی حدیث کی روایت کی ہے۔

(مع اختلاف)

ہاں حضرت عمر اور حضرت ابو ہریرہ کی روایتوں کے مابین کہیں کہیں کچھ لفظی اختلاف ہے۔ (فیہ) یعنی ابو ہریرہ کی روایت کردہ حدیث میں بتصریح علامہ ابن حجر عسقلانی، پہلی بات یہ ہے کہ 'رُكُّوْا عَلٰی الرَّجُلِ'۔

اور ایک روایت میں ہے 'رُكُّوْةٌ فَلَمْ يَزَوْا شَيْئًا' مرد کو میرے حضور پٹالا۔ مگر جب اسکو پٹالانے کی غرض سے لوگ باہر گئے تو کوئی نظر نہ آیا۔ پھر حضور نے ان کو باخبر کر دیا کہ وہ جبریل تھے۔ غور فرمائیے کہ حضرت ابو ہریرہ کی اس روایت میں اس بات کی قطعی صراحت نہیں ہے کہ حضور نے صحابہ کو اس مجلس میں بتا دیا تھا کہ یہ جبریل تھے جس مجلس میں یہ سارا واقعہ پیش آیا۔ تو پھر اس روایت کو حضرت عمر کی اس روایت کے خلاف کیسے سمجھا جائے جس میں حضرت عمر نے فرمایا کہ حضور نے ہم لوگوں کو تین دن کے بعد یہ خبر دی کہ وہ جبریل تھے۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں دوسری بات یہ ہے وَأَذَارَ آيَتِ الْخَفَاءِ الْعَرَاءَةِ اور جب دیکھے تو نگے پاؤں۔۔۔۔۔ نگے بدن رہنے والوں کو، (الْكُفْمُ) اور ان کو جو حق کو سننے اور اسکو قبول کرنے سے بہرے ہیں (الْكُفْمُ) اور ان کو جو سچ بات کہنے میں گونگے ہیں۔ (مُلُوكُ الْأَرْضِ) زمین پر متصرف و قابض اور حکومت کرنے والا (فِي نَفْسِ) اس کو ملوک الارض کا حال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں پوری عبارت کی شکل یہ ہو جائے گی۔ (وَأَذَارَ آيَتِ الْخَفَاءِ الْعَرَاءَةِ الْكُفْمُ الْكُفْمُ مُلُوكُ الْأَرْضِ مُتَفَكِّحُونَ فِي خُمْسٍ) اور جب تو دیکھے کسی زمانہ میں نگے پاؤں اور نگے بدن رہنے والے بہرے اور گونگے یعنی احمق اور بے وقوف بادشاہوں اور زمین پر حکومت کرنے والوں کو، ان پانچ امور میں غور کرنے والا۔ تو سمجھ لو کہ قیامت قریب ہے۔

احق اور بے وقوف بادشاہوں کا یہ عجیب مزاج ہوتا ہے کہ وہ انہیں امور میں زیادہ غور و فکر کرتے ہیں جو ان کی دسترس فہم و فراست سے باہر ہوتی ہے اور جہاں تک ان کا طائر اور اک نہیں پہنچ سکتا۔ تو مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں قیامت کی تمام نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ جب قیامت قریب ہوگی تو احمق و بے وقوف اور عقل سے کورے ارباب اقتدار ان امور خمسہ کے بارے میں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے، خوب خوب رائے زنی کریں گے۔ فِی خُمْسٍ وَمَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ کے اعلم سے بھی متعلق کیا جاسکتا ہے اس وقت پوری

یعنی فی نفس کا تعلق جس فعل سے ہے وہ مقدر و محضوف ہے اب معنی یہ ہوا کہ علم قیامت کا ذکر اللہ نے ان امورِ منہ میں کیا ہے (جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) یا علم قیامت کو تو ان پانچوں امور میں پائے گا جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں)

فی خمس میں بعض نے فی کومع (ساتھ) کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے من (سے) کے معنی میں لیا ہے۔ (ثم قراء) یعنی نبی کریم ﷺ نے (فِی خُمْسٍ لَا یَعْلَمُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ) فرمایا اور پھر ان آیات کریمہ کی تلاوت کی جن میں ان علوم خمسہ کا ذکر ہے جن کو خدا ہی جانتا ہے۔ یا یہ بھی ممکن ہے قرء کے فاعل حضرت ابو ہریرہ ہوں، یعنی حضرت ابو ہریرہ نے بطور استبہاد یا فرمانِ رسول کے مصداق کو متعین کرنے کی غرض سے ان آیات کی تلاوت فرمائی۔ (متفق علیہ)

یعنی حضرت ابو ہریرہ کی روایت کردہ اس حدیث کی جس میں کچھ اضافہ ہے امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کی ہے۔ اس مقام پر یہ انکشاف یقیناً قابل حیرت ہوگا کہ امام بخاری نے اپنی کسی روایت میں **الْقُصَمُ إِلَيْكُمْ مُلُوكُ الْأَرْضِ** کا ذکر نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ بخاری کی کتاب الایمان کی روایت میں **اذن تطاول رعاة الابل البهم** کا فقرہ ہے اور کتاب التفسیر کی روایت میں یہ کلمات ہیں۔ **إِذَا كَانَ الْحَفَاةُ الْعَرَاةَ وَمِنَ النَّاسِ فَذَلِكَ مِنْ أَشْرَاطِهَا۔**

--- الغرض --- حضرت ابو ہریرہ کی روایت کردہ حدیث بھی اصولی طور پر متفق علیہ



نہ رہی۔ اب شاید اس کو متفق علیہ اسلئے کہا گیا ہے کہ اس حدیث کی حضرت ابو ہریرہ سے امام بخاری نے جن لفظوں میں روایت کی ہے وہ اس روایت سے جو حضرت ابو ہریرہ ہی سے امام مسلم نے کی ہے۔ معنوی کامل اتفاق رکھتی ہے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ دونوں روایتوں کے اکثر و بیشتر الفاظ بھی ملتے جلتے ہیں۔ ۹۲۔۔۔۔۔ فی خمس لا یعلمھن الا اللہ قیامت کا علم ان پانچ امور میں سے ہے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اسی کے تحت فرماتے ہیں۔  
 'مراد آنست کہ بے تعلیم الہی بحساب عقل هیچ کس  
 این ہار انداند آنہا از امور غیب اند کہ جزء خدا کسے  
 آن راننداند مگر آن کہ وہ تعالیٰ از نزد خود  
 کسے رابد انا ندبوحی والہام'  
 (توحید المعات)

ترجمہ۔۔۔۔۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کے بتائے بغیر صرف اپنی عقل سے کوئی شخص ان امور کو نہیں جانتا کیونکہ یہ امور غیب سے ہیں ان کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر یہ کہ خود اللہ تعالیٰ کسی کو وحی والہام کے ذریعہ بتادے۔  
 ۔۔۔۔۔ حضرت شیخ موصوف ہی لمعات میں فرماتے ہیں:

الْمُرَادُ لَا تَعْلَمُ بِلَوْحٍ تَعْلِيمِ اللَّهِ۔۔۔۔۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کی تعلیم کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔ یعنی جو جانتا ہے وہ اللہ کے بتانے سے ہی جانتا ہے۔

حضرت ملا علی قاری علیہ الرحمۃ وبارکاتہ اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب عالم محسوسات کی ظلمتوں سے کنارہ کشی، آمینہ قلب کی کدورات نفسانی سے تطہیر و تجلی علم و عمل پر مواظبت و ہیکلی اور انوار الہیہ کے فیضان کے سبب روح قدسی روشن ہو جائے اور اسکی نورانیت و اشراق اور چمک دمک بڑھے، یہاں تک کہ اسکا نور اتنا قوی ہو جائے جو ساری فضائے قلب پر چھا جائے۔۔۔۔۔

فَتَنَعَّسَتْ فِيهِ النُّفُوسُ الْمُرْتَسِمَةُ فِي اللُّوحِ الْمَحْفُوظِ  
 يَطْلُعُ عَلَى الْغَيْبَاتِ وَيَنْصَرِّفُ فِي أَجْسَامِ الْعَالَمِ

السَّغْلَى بَلْ يَتَجَلَّى - حِينَئِذٍ الْفَيَاضُ الْقُدْسُ  
بِمَعْرِفَتِهِ الْبُحَى هِيَ أَشْرَفُ الْعَطَايَا فَكَيْفَ بَغِيْرَهَا  
(مرقات)

--- تو پھر قلب پر لوح محفوظ کے نقوش کا عکس آتا ہے اور آدمی مغیبات پر مطلع ہوتا ہے اور عالم  
سغلی کے اجسام پر تصرف کرتا ہے بلکہ اس وقت فیاض القدس خدائے تعالیٰ کی معرفت کا انکشاف  
ہوتا ہے جو کہ بہترین نعمت ہے۔ تو دیگر اشیاء کا (انکشاف) کس شمار میں ہے۔  
--- ملا علی قاری ہی فرماتے ہیں:

فَمَنْ أَدْعَى عَلَّمَ نَسِي وَمِنْهَا غَيْرُ مُسْتَقْد إِلَيْهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ  
وَالسَّلَامُ كَانَ كَأَذْبَانِي دَعْوَةٍ (مرقات)

جو شخص ان پانچ چیزوں میں سے کسی چیز کے علم کا دعویٰ کرے  
حضور اکرم ﷺ کی طرف نسبت کئے بغیر وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔  
ان امور میں سے کسی ایک چیز کا بھی علم کسی کو واسطہ نبی کریم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یہی  
ملا علی قاری مرقات ہی میں کتاب عقائد مؤلف شیخ ابو عبد اللہ شیرازی سے نقل فرماتے ہیں۔  
نَعْتَقِدُ أَنَّ الْعَبْدَ يَنْقَلُ فِي الْأَحْوَالِ إِلَى نَعْتِ الرُّوحَانِيَّةِ فَيَعْلَمُ الْغَيْبِ  
ہمارا عقیدہ ہے کہ بندہ ترقی مقامات پا کر معرفت روحانی تک  
پہنچتا ہے اس وقت اسے علم غیب حاصل ہوتا ہے۔

--- نیز --- کتاب عقائد ہی سے نقل کرتے ہیں:

يَطْلُعُ الْعَبْدُ عَلَى حَقَائِقِ الْأَشْيَاءِ وَيَتَجَلَّى لَهُ الْغَيْبُ وَغَيْبُ الْغَيْبِ  
(انوار ایمان کی قوت بڑھنے پر) بندہ حقائق اشیاء پر مطلع ہوتا ہے  
اور اس پر صرف غیب ہی نہیں غیب الغیب روشن ہو جاتا ہے۔

--- اور یہی ملا علی قاری اسی مرقات میں فرماتے ہیں:

النَّاسُ يُنْقَسِمُ إِلَى فِطْنٍ يَذُرُّكَ الْعَاقِبُ كَالْمَشَاهِدَةِ وَهُمْ  
الْأَنْبِيَاءُ وَالْإِنْبِيَاءُ مِنَ الْعَالَمِ عَلَيْهِمْ مَتَابَعَةُ الْحُسْنِ وَالْوَهْمِ  
فَقَطُّ أَكْثَرُ الْخَلَائِقِ فَلَا يَكُنْ لَهُمْ مِنْ مَعْلَمٍ يَكْشِفُ لَهُمْ  
الْمُعْجِبَاتِ مَا لَهُمْ إِلَّا النَّبِيُّ الْمُبْعُوْثُ لِهَذَا الْأَمْرِ -

آدمیوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ ذرک جو غیب کو شہادت کی طرح جانتے ہیں  
اور وہ انبیاء ہیں۔ دوسرے وہ جن پر صرف حس و وہم کی بیرونی غالب ہے۔

اکثر مخلوق اسی جسم کی ہے تو ان کو ایک بتانے والے کی ضرورت ہے  
جو ان پر غیوں کو کھول دے اور وہ بتانے والا اسوائے نبی کے  
اور کوئی نہیں جو اسی کام کیلئے بھیجا جاتا ہے۔

یہ مقام اس بات کا متحمل نہیں کہ میں مسئلہ غیب نبی کے تمام مالہ و ماعلیہ کو مفصل طور پر  
بیان کروں۔ اس مسئلہ سے متعلق جن کو اطمینان بخش معلومات چاہئے وہ الکلمۃ العلیا، مصنفہ  
صدر الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مراد آبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کا غیر متعصبانہ اور  
منصفانہ مطالعہ کریں۔

---- بایں ہمہ ---- مناسب سمجھتا ہوں کہ چند ایسی باتیں سامنے رکھ دوں جنہیں اصولی  
اور بنیادی حیثیت حاصل ہے اور جنہیں سمجھ لینے کے بعد عقیدہ علم غیب نبی کی شرعی صورت سامنے  
آ جاتی ہے۔ ---- نیز ---- مسئلہ علم غیب پر غور و فکر کرنے کی ایک راہ ملتی ہے۔  
عقائد و مسائل کی تین نوعیتیں ہیں:

(الف) ---- ایک تو وہ جو ضروریات دین سے ہوں، انکا منکر بالاتفاق دائرہ اسلام  
سے خارج ہے۔

(ب) ---- دوسرے وہ جو ضروریات اہلسنت و جماعت سے ہوں، ان کا منکر  
بالاتفاق دائرہ اہلسنت سے باہر اور بد مذہب و گمراہ ہے۔

(ج) ---- تیسرے وہ جو خود علمائے اہلسنت کے مابین مختلف فیہ ہوں، انکے انکار  
کرنے والوں کو بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور اقرار کرنے والوں کو بھی۔ یعنی طرفین میں کسی پر کفر یا  
گمراہی کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اپنی ذاتی تحقیق یا اپنے معتمد علماء کی تحقیق پر اعتماد و بھروسہ کرتے ہوئے  
ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جس قول کو راجح سمجھے اس کو اپنالے۔ اس پر کسی طرح کا کوئی الزام نہیں۔  
ہاں جو رہنمائے عناد مخالف ہیں، وہ ضرور مجرم ہیں۔

---- مثلاً ---- قُلْ لِّلّٰہِ فَوْقَ کُلِّ شَیْءٍ عِلْمٌ کو دلیل بنا کر اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ کا ہمارے  
ہاتھ کی طرح ہاتھ ہے، تو وہ قطعاً کافر ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا ہمارے جیسا ہاتھ سے پاک ہونا  
ضروریات دین سے ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ اس کا یہ جسم ہی سے ہے مگر اجسام کی مشابہت سے  
پاک و منزہ ہے، وہ گمراہ اور بدوین ہے۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا جسم و جسمانیات سے مطلقاً پاک و منزہ

ہونا ضروریات عقائد اہلسنت و جماعت سے ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہے اللہ تعالیٰ کیلئے یہ ہے لیکن مطلقاً جسمیت سے بری و مبری ہے، وہ اسکی ایک صفت قدیمہ ہے۔ جس کی حقیقت ہم نہیں جانتے۔ اور نہ اس میں تاویل کرتے ہیں، وہ قطعاً مسلمان سنی صحیح العقیدہ ہے۔ اگرچہ یہ عدم تاویل کا مسئلہ اہلسنت کا خلافیہ ہے، متاخرین نے تاویل اختیار کی ہے۔

۔۔۔۔۔ المختصر۔۔۔۔۔ نہ تاویل سے بچنے والوں کو گمراہ کہا جائے گا اور نہ تاویل کرنے والوں کو۔ دونوں ہی سنی صحیح العقیدہ ہیں۔

اس مثال کو سمجھ لینے کے بعد آئیے مسئلہ علم غیب کو ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں بھی تینوں صورتیں ملتی ہیں:

(۱)۔۔۔ اللہ عز و جل ہی عالم بالذات ہے۔ بے اسکے بتائے ہوئے ایک حرف کوئی نہیں جان سکتا۔ رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض غیب کو علم دیا۔ رسول اللہ ﷺ کا علم اوروں سے زائد ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن کو ماننا ضروریات دین سے ہے۔ اور ان کا منکر اور اس میں ادنیٰ شک کرنے والا قطعاً کافر ہے۔

(۲)۔۔۔ اولیائے کرام کو بھی رسولوں کی وساطت سے علوم غیب ملنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبوں خصوصاً سید الخوین ﷺ کو غیب خمسہ سے بہت سے جزئیات کا علم بخشا۔ ان امور مذکورہ پر عقیدہ ضروریات اہلسنت سے ہے، جن کا منکر بد مذہب و گمراہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو تعین وقت قیامت کا بھی علم ملا۔

(۳)۔۔۔ حضور کو بلا استثنا جمیع جزئیات خمس کا علم ہے، جملہ مکتوبات قلم اور مکتوبات لوح۔

۔۔۔۔۔ الحاصل۔۔۔۔۔ روزِ اوّل سے روزِ آخر تک تمام ماکان و مایکون جو لوح محفوظ میں مندرج ہے اس سے بھی بہت زیادہ کا علم ہے۔ لوح محفوظ میں قیامت کے سوا تمام امور خمسہ کا ذکر ہے۔ اور ایک قول پر قیامت کا بھی ذکر ہے۔۔۔۔۔ الغرض۔۔۔۔۔ رسول کریم کو ان سب کا علم ہے۔ نبی کریم کو حقیقت روح کا بھی علم ہے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ جملہ تشابہات قرآنیہ کا بھی علم ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن میں خود علماء و ائمہ اہلسنت مختلف رہے ہیں۔

مگر انکے اختلاف اخلاص و تحقیق پر مبنی ہیں جہاں بغض و عناد کا گزر نہیں۔ ان علمائے

کرام کے اختلاف کو ان معاندین کی مخالفت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا جو تقدیس رسالت کی نفی ہی کو توحید الہی سمجھتے ہیں۔

--- الغرض --- یہ رہے تین خانے: پہلا خانہ ان عقائد کا ہے جو ضروریات دین سے ہے۔ اس خانے کے ہر عقیدے کا ثبوت ایسی دلیل سے ہونا چاہئے۔ جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہوں۔

قطعی الثبوت کا مطلب یہ ہے کہ انکا ثبوت قرآن مجید یا ایسی احادیث ہوں جو متواتر ہوں یعنی جیسے روایت کرنے والے حضور ﷺ سے لیکر آج تک ہر زمانہ ہر فرق میں مختلف طبقات اور مختلف شہروں کے لوگ اس کثرت سے رہے ہوں کہ ان سب کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال سمجھا جائے۔ اور قطعی الدلالت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو عبارت قرآن کریم میں اس حکم کے متعلق واقع ہوئی ہے، یا حدیث متواتر سے ثابت ہوتی ہے وہ اپنے معنی و مراد کو صاف ظاہر کرتی ہو۔ اس میں کسی قسم کا الجھاؤ اور ابہام نہ ہو۔

دوسرا خانہ ہے ان عقائد کا جو ضروریات اہلسنت سے ہیں۔ اس خانہ کے کسی عقیدے کے ثبوت کیلئے دلائل میں ایسی قوت و توانائی کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے جو قوت و توانائی پہلے خانہ کے عقیدوں کے ثبوت کیلئے درکار ہے۔ بلکہ اس خانہ کے عقائد کو صحیح ثابت کرنے کیلئے وہی دلائل کافی ہیں جن سے ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے۔

تیسرا خانہ ان عقائد کا ہے جو باب فضائل سے متعلق ہے۔ انکے ثبوت کیلئے تو حدیث ضعیف بھی معتبر و مقبول ہے۔ یعنی اس تیسرے خانہ میں جو عقیدے آتے ہیں انکو ثابت کرنے والے دلائل میں اس قوت و توانائی کی ضرورت نہیں جو دوسرے خانہ والے عقیدوں کو ثابت کرنے والے دلائل میں ضروری ہے۔

اس مختصر گفتگو کو نظر میں رکھ کر اب دیکھئے کہ مسئلہ علم غیب سے متعلق کون سے عقیدے کس خانے میں آتے ہیں اور پھر اسکے بعد تجزیہ کیجئے علمائے ملت اسلامیہ کے ان دلائل کا جو ہر خانہ کے عقائد کے ثبوت کیلئے وہ دیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس تجزیہ کے بعد نہ تو آپ اپنی فریب خوردگی کے اسیر ہو گئے اور نہ اسکی فریب دہی کا شکار ہو گئے جو ہر خانہ کے عقیدوں کے ثبوت کیلئے



دلیل قطعی (قطعی الثبوت و قطعی الدلالة) ہی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور لطف تو یہ ہے کہ اپنے مروجہات و بدعتیہ کی کثرت کیلئے اپنے قیاس فاسد پر ایسا بھروسہ کر لیتا ہے گویا اس کا قیاس ہی نص قطعی ہے۔ عقائد کے تجزیہ کے بعد آپ پر یہ بھی اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ علمائے ملت اسلامیہ کے مابین عقیدہ علم غیب نبی سے متعلق اگر کوئی اختلاف ہے تو وہ انھیں عقائد میں ہے کہ جن کا تعلق تیسرے خاندانے عقیدوں سے ہے لہذا ان کی آپس کی اختلافی تحریریں معاندین کیلئے ہرگز سودمند نہیں۔

اب آئیے ایک دوسری اصولی بات ملاحظہ فرمائیے۔۔۔۔۔

خدا تعالیٰ کا علم اور اس کی ہر ہر صفت ذاتی ہے، یعنی کسی کی عطا سے نہیں۔ جو خدا کی کسی صفت کو ذاتی نہ مانے یا عطا کی کہ وہ بالاتفاق کافر ہے۔ اب خدا کیلئے جس صفت کو بھی ثابت کیا جائے گا خواہ وہ ثابت کر نیا والا خود خدائے تعالیٰ ہو یا کوئی اور، بہر صورت وہ صفت ذاتی ہی ہوگی، خواہ لفظی میں ذاتی کی قید ظاہر ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح اگر آپ کسی صفت کی کسی غیر خدا سے نفی کر کے اس کو خدا کیلئے ثابت کریں گے تو یقیناً اور بدلائے وہ صفت وہی ہوگی جو خدا کیلئے ثابت ہو سکے، یعنی صفت ذاتی۔۔۔۔۔ المختصر۔۔۔۔۔ جس شان کی صفت کا خدا کیلئے ثبوت ہوگا اس شان کی صفت کی غیر خدا سے نفی کی جائے گی۔

۔۔۔۔۔ الحاصل۔۔۔۔۔ اگر بعض نصوص میں علم غیب کی ساری مخلوق سے نفی کر کے اس کو صرف خدا کی ذات کیلئے ثابت کیا گیا ہے، یقیناً ان نصوص میں ساری مخلوق سے اسی علم غیب کی نفی ہے جو ذات خدا کیلئے ثابت ہو سکے اور وہ ہے علم غیب ذاتی۔۔۔۔۔ الغرض۔۔۔۔۔ ساری مخلوق سے نفی اسی علم غیب ذاتی کی ہے اور خدا کیلئے ثبوت اسی علم غیب ذاتی کا ہے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ نفی کی آیات میں ساری مخلوق سے علم غیب عطائی کی نفی کر کے اسی کو خدا کیلئے ثابت کیا ہے تو وہ شخص بالاتفاق دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

۔۔۔۔۔ المختصر۔۔۔۔۔ جہاں جہاں علم غیب کی نفی ساری مخلوق سے کر کے اس کو صرف خدا کیلئے ثابت کیا گیا ہے۔ وہاں وہاں علم غیب سے مراد ذاتی علم غیب ہی ہے۔ اسلئے کہ ذاتی علم غیب ہی خدا کیلئے ثابت ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔۔ جن نصوص میں غیر خدا سے مطلقاً علم غیب کی نفی کی گئی ہو اور بس اس میں بھی علم غیب سے مراد علم غیب ذاتی ہے اسلئے کہ بعض مخلوق کیلئے بعض علوم

غیبیہ کا ثبوت دلیل قطعی سے ثابت ہے۔ یہاں تو مجھے صرف اصولی گفتگو کرنی ہے اسلئے میں دلائل سے چھیڑ چھاڑ نہیں کر رہا ہوں۔

اب تیسری اصولی بات ملاحظہ فرمائیے۔۔۔۔۔

--- مثلاً۔۔۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ غیب کی وہ پانچ باتیں جن کو امور خسرہ، غیوب خسرہ کہا جاتا ہے اللہ نے انکا بعض علم نبی کریم کو عطا فرمایا ہے۔ اب اسکا رد کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ پہلے مندرجہ ذیل امور کو دلائل و براہین کی روشنی میں ثابت کرے، ورنہ اسکی بات ناقابل قبول ہوگی۔

(۱)۔۔۔ یہ پانچ غیب کی باتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کسی کو بتانے پر قادر نہیں ہے۔

(۲)۔۔۔ اللہ تعالیٰ بتانے پر قادر تو ہے مگر اسکے بتانے اور مطلع کرنے پر بھی کوئی ان

غیب کی باتوں پر مطلع نہیں ہوتا۔

(۳)۔۔۔ اللہ غیب کی ان باتوں کو بتانے پر قادر تو ہے مگر کسی کو بتانا نہیں اور مطلع نہیں کرتا۔

(۴)۔۔۔ اللہ تعالیٰ غیب کی دوسری باتوں پر مطلع تو کرتا ہے مگر ان پانچ چیزوں کے کسی بعض پر بھی کسی کو مطلع نہیں کرتا۔

مذکورہ بالا ان چار باتوں میں سے پہلی بات کا اعتراف اِنَّ اللہ علیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر کا انکار ہے۔ دوسری بات کا اعتراف اپنی جہالت کے اعتراف کے مترادف ہے۔ تیسری بات کا اعتراف ارشادِ باری۔۔۔۔۔

فَلَا یُظْہِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ اَحَدًا ۝۱۰۸ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ

﴿سورۃ الجن: ۲۶، ۲۷﴾

تو نہیں مکمل آگاہی دیتا غیب پر کسی کو، مگر جسے چن لیا رسول سے

﴿معارف القرآن﴾

۔۔۔۔۔ کے خلاف عقیدہ سازی ہے اور چوتھی بات کا اعتراف ان تمام احادیث صحیحہ کو چیلنج کرنا ہے۔ جنہوں نے نبی کریم کیلئے غیوب خسرہ کے بعض جزئیات کے علم کے اعتراف کو ضروریاتِ اہلسنت سے قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح کا چیلنج کسی ہدایت یافتہ کی طرف سے ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ ناممکن ہے۔ یہ تھے میرے اصولی معروضات۔ مسائل کو سمجھنے میں جواہر کی رعایت کرے گا، انشاء اللہ بہت سارے مغالطوں سے بچا رہے گا۔

## ”گزارش“

اس ادارے کی سب سے اہم اشاعت ”معارف القرآن“ ہے جو کہ قرآن حکیم کا اردو میں نہایت شاندار ترجمہ ہے۔ اور ہماری دوسری شائع کی ہوئی کتابیں بلا ہدیہ ہیں جو کہ صرف ڈاک کا خرچہ ارسال کر کے ہم سے منگوائی جاسکتی ہیں۔ گزارش ہے کہ دین کا زیادہ سے زیادہ علم خود بھی حاصل کریں اور اپنے اہل خانہ کو بھی بہم پہنچائیں۔ اردو، انگلش اور دوسری زبانوں میں اسلامی لٹریچر فراہم کرنا اس ادارے کا ایک اہم مقصد ہے۔ ہمارے دیئے گئے نمبروں پر فوراً ہم سے رابطہ قائم کیجئے۔

ادارہ



## تصدیق نامہ

میں نے گلوبل اسلامک مشن، ایک، نیویارک، ریاستہائے کی کتاب بنام

## تعلیم دین و تصدیق جبرائیل امین

کی طباعت کے وقت اسکے ہر صفحہ کو حرفاً بحرفاً بغور پڑھا ہے۔

تصدیق کی جاتی ہے کہ اس میں موجود قرآن کریم کی آیات کریمہ اور احادیث شریفہ کے الفاظ اور اعراب دونوں بالکل صحیح ہیں۔ اور میرا یہ سرٹیفکیٹ درستگی اور اخلاط سے پاک ہونے کا ہے۔ دورانِ طباعت اگر کوئی زیر، زبر، پیش، جزم، تشدید یا نقطہ چھپائی میں خراب ہو جائے تو اس کا متن کتابت کی صحت سے تعلق نہیں ہے۔۔۔۔۔ علاوہ ازیں۔۔۔۔۔ کتاب ہذا میں کوئی مضمون ملک و ملت کے خلاف نہیں ہے۔

فقط

المصدق



مطالعہ محمد امجد علی خان

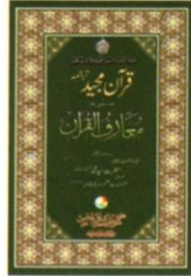
Syed Mohd. Azhar Ali Noor  
Research & Registration Officer  
Islamabad

سید محمد عظمت علی نوری  
ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر  
(محمد ابراہیم، سندھ) کراچی

گلوبل اسلامک مشن، ایک  
نیویارک، ریاستہائے

# معارف القرآن

اردو  
ترجمہ  
قرآن



مترجم: مخدوم المملت ابوالمحامد حضور سید محمد محدث اعظم ہند

آسان، بہترین اور انوکھا ترجمہ قرآن جس کے بارے میں اعلیٰ حضرت

احمد رضا خان صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دشمن اوسے تم نے اردو میں قرآن لکھا ہے۔۔۔



المعذوف بہ

سید التفہیم

تفسیر الشریعہ

﴿الْحَقَّ - سَيَقُولُ ۚ تَلَوْتُ الرِّسَالَ ۚ﴾



چالیس احادیث  
مبارکہ کی محققانہ  
مفصل شرح

الابواب البیضاء

شیخ الاسلام والمسلمین

حضرت علامہ محمد امجد علی شمس الدین

علماء حق کی سرپرستی میں رواں دواں



اہلسنت وجماعت کا ایک چمکتا روشن ستارہ

Mailing Information:

P.O. Box 100  
Wingdale, NY 12594  
U.S.A.

کُلُّوْا اِسْلَامًا مُّشْرِئًا  
کُلُّوْا اِسْلَامًا مُّشْرِئًا

Contact Information:

Toll Free: (800) 786-9209  
www.globalislamicmission.com  
GIMUSA@GMAIL.COM

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ